تعارف فقہ

فقہ کی تاریخ،تدوین اور مراحل پر مشتمل معتدل اور
منصفانہ جائزہ ،تقلید کی حقیقت،اقسام اور حیثیت

مرتب
سید عبدالوہاب شیرازی

اِدارۃُ الصِّدّیق

فہرست

نوٹ:

یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی،

اگر کوئی شخص یا ادارہ شائع کرنا چاہے تو رابطہ کریں:

0321-5083475

Email: Sherazi313@gmail.com

فقہ کی تعریف

لغوی معنی:

تفقہ باب تفعل سے ہے جس کی اصل فقہ ہے اور فقہ کے معنی کسی چیز کے چھلکے کو اتار کر اس کے مغز کو پانا ہے۔لفظ فقہ کو جب باب تفعل میں لے گئے ت اس معنی میں اور قوت پیدا ہو گئی یعنی مغز کو پانے کی کوشش کرنا تفقہ ہے۔

علامہ زمخشری کہتے ہیں:۔فقہ کا لغوی معنی پھاڑنا اور کھولنا ہے۔

قرآن و حدیث میں فقہ کا لفظ ان معانی میں استعمال ہوا ہے:

آ گہی، علم و دانش، سمجھ، فہم، دانائی، ،فہم و ذکاوت، یعنی ایسی بصیرت و ادراک کا موجود ہونا جس سے افعال و اعمال کی غایت اور مقصود کا علم و شعور حاصل ہو سکے۔

فلولا نفر من کل فرقة منهم--------- (التوبہ۔ ۱۲۲)

ترجمہ: اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تا کہ "دین کی فقہ" (سمجھ) حاصل کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو انکو ڈر سناتے تا کہ وہ بھی محتاط ہو جاتے۔

فما لهؤلاء القوم لايكادون يفقهون حديثا۔ (النساء۔ ۷۸)

پس اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنے کے قریب ہی نہیں آتے۔

لفظ فقہ حدیث میں

لفظ فقہ صحاح ستہ، مسند دارمی، مؤطا امام مالک اور مسند احمد میں تقریبا 104 مقامات پر بحذف تکرار آیا ہے، جن میں سے اکثر جگہ پر وہ اسی مفہوم (سمجھ بوجھ) میں آیا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

☆ " مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهُ فِي الدِّيْنِ" (متفق عليه)

اللہ تعالیٰ جس کیلئے خیر چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عطاء فرماتا ہے۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

☆فَقیه واحِد اَشد علی الشیطانِ مِن الفِ عابدٍ(ابن ماجه، باب فضل العلماء)

ترجمہ: ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے بھاری ہوتا ہے۔(کیونکہ عابد کی عبادت بغیر بصیرت ہوتی ہے اس لئے شیطان کو اسے گمراہی کے گڑھے میں دھکیلنا اور شکوک وشبہات میں پھانسنا آسان ہوتا ہے، جبکہ فقیہ اس کی سازشوں سے واقف ہوتا ہے اور اس کے فریب میں نہیں آتا۔)

اسی لئے شرعی اصطلاح میں ''فقہ'' کا لفظ علم دین کا فہم حاصل کرنے کے لئے مخصوص ہے۔

☆ " اِنَّ النَّاسَ لَكُمْ تبَعٌ وَ اِنَّ رِجَالاً يَأتُونَكُمْ مِنَ الْأُرْضِ يَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّيْنِ فَإِذَا أَتَوْكُمْ فَاسْتَوْ صُوْا بِهِمْ خَيْرًا" (ترمذی،دارمی)

"لوگ تمھارے متبع ہیں۔کچھ لوگ تمھارے پاس دین کی بصیرت حاصل کرنے آئیں تو انہیں اچھی طرح فہمائش ونصیحت کرو"۔

☆والناس معادن خیارهم فی الجاهلیة خیارهم فی الاسلام اذافقهوا۔(بخاری)

لوگ کان کی مثل ہیں ان میں جو لوگ جاہلیت میں بہتر تھے وہی اسلام میں بھی بہتر ہیں بشرطیکہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرلیں۔

☆ نَضَّرَ اللهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيْثًا فَحَفِظَهٗ حَتّٰي يُبَلِّغَهٗ غَيْرَهٗ فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهِ اِلٰى مَنْ هُوَأَ فْقَهُ مِنْهُ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهِ لَيْسَ بِفَقِيْهِ " (ترمذی،ابو دائود)

" اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے ہم سے حدیث سنی اور اسے یاد کیا اور اُسے دوسروں تک پہنچایا کیونکہ بہت سے فقہ کے حامل حدیث کو اپنے سے زیادہ فقیہ تک پہنچا دیتے ہیں اور بعض فقہ کے حامل خود فقیہ نہیں ہوتے"۔

مذکورہ بالا تشریح کے اعتبار سے یہ لفظ حکمت سے قریب تر ہو جاتا ہے جسے قرآن نے خیرِ کثیر فرمایا

ہے۔

وَمَنْ يُؤتَ الحكمة فقد أوتى خيرًا كثيرًا (البقرۃ۔ ۲۶۹) (دینی بصیرت فہم وفراست)

اصطلاحی تعریف

"☆احکام کی گہرائی میں اُتر کران کی حقیقت کودریافت کرنا۔

☆فقہ ایسی دینی بصیرت اور قلبی دانائی کا عنوان ہے جس کی روشنی میں مفیداور مبنی پر خیر اُمور کا شعور اور مضرت رساں امور کا ادراک حاصل ہو جائے"۔

☆عہد صحابہؓ وتابعینؒ تک جب بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا تواس سے یہی دینی فہم مرادلیا جاتا تھا جس میں عقائد،عبادات،اخلاقیات و معاملات سب داخل سمجھے جاتے تھے۔مگر جب ہرفن کی جدا جدا تدوین شروع ہوئی تو ہرفن کیلئے جداجدا اصطلاحیں وضع ہوئیں۔اس وقت علم فقہ سے عقائد واخلاق کی بحث کوعلیحدہ کرلیا گیااور فقہ کا دائرہ عبادات،معاملات اور معاشرت کے ظاہری احکام تک محدود ہو گیا اوران احکام کے جو اخلاقی وروحانی پہلو ہیں،آہستہ آہستہ فقہ کی کتابوں میں ان سے بحث کرنا ترک ہو گیااوران تینوں شعبوں کے "عملی احکام" کوجاننے ہی کا نام "علمِ فقہ "ہو گیا۔

"عقائد کی بحث کیلئے "علم کلام "وجود میں آیا"اور "احکام کے اخلاقی وروحانی پہلو یعنی احسان اور تزکیۂ نفس کیلئے' تصوّف'' کی اصطلاح وضع ہوئی"۔مثلاً ابتداء میں نماز کے بیان میں اس کے ظاہری ارکان کے ساتھ خشوع وخضوع اورانابتِ قلبی کا بھی ذکر ہوتا تھامگر بعد میں فقہ کے اندرنماز کے ظاہری ارکان کی تفصیل سے بہت زیادہ بحث ملے گی۔مگراس کے روحانی اوراخلاقی پہلو پر کم بحث ہونے لگی۔لیکن ابتداء میں "فقہ فی الدین" کا لفظ نفس دین اور سارے دینی احکام میں سمجھ بوجھ حاصل کرنے کیلئے بولا جاتا تھا خواہ وہ ایمان و عقیدہ کے مسائل ہوں یا قانونی احکام ہوں یا اخلاقی اورروحانی ہدایات ہوں۔چنانچہ امام ابوحنیفہؒ جن سے فقہ اسلامی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوا انہوں نے فقہ کی تعریف ان الفاظ میں کی۔

" مَعرِفَتُ النَّفُسِ مَا لَهاَ وَمَا عَلَيُها" (البحرالرائق)

"ہر شخص جان لے کہ اس کیلئے (دنیا وآخرت میں) کیا چیز مفید اور کیا مضر ہے"۔

فقہ میں عام طور پر ان تین شعبوں سے بحث کی جاتی ہے۔

۱۔عبادات ۲۔معاملات ۳۔مزاجر

ابن نجیمؒ نے معاملات ہی میں معاشرتی احکام یعنی مناکحات کو بھی داخل کر دیا ہے اگر اس کا ذکر الگ کیا جائے تو اسلامی احکام کی چھ قسمیں ہو جاتی ہیں اگر بین الاقوامی معاملات کو بھی شامل کیا جائے۔ جسے فقہا " باب الجہاد والسیر " کے نام سے یاد کرتے ہیں تو سات قسمیں بنتی ہیں۔

چنانچہ اس اعتبار سے آٹھ قسمیں ہیں۔

۱۔اعتقادات ۲۔عبادات ۳۔معاملات ۴۔مناکحات

۵۔الجہاد والسیر ۶۔آداب ۷۔مزاجر

چنانچہ اسلامی فقہ کے اس وسیع دائرے سے انسانی زندگی کا کوئی پہلو خالی نہیں ہے۔ بعد میں مختلف فنون کی تقسیم ہونے پر فقہا نے فقہ کے مجرد عملی احکام کو عقائد و اخلاق کی بحث سے جدا کر لیا اور پھر فقہ کی تعریف ایسے کی۔

" اَلْعِلْمُ بِالْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ الْعَمَلِيَّةِ الْمُكْتَسِبُ مِنْ أَدِلَّتِهَا التَّفْصِيلِيَّةِ اَو هُوَ هٰذِهِ الْاَحْكَامُ نَفْسُهَا۔ "

"فقہ شریعت کے عملی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ جاننے کا نام ہے یا فی نفسہ یہی احکام فقہ کہلاتے ہیں"

امام اعمش رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے کہا:

انتم الاطباء و نحن الصيادله

آپ حکیم ہیں اور ہم عطار، یعنی ہم جڑی بوٹیاں اکھٹی کر کے صاف کر کے دکان میں رکھتے ہیں پھر آپ اس سے نسخہ تیار کرتے ہیں۔ امت میں فقہاء وہی ہوتے ہیں جو پہلے محدث ہوتے ہیں، یعنی ہر فقیہ محدث

بھی ہوتا ہے لیکن ہر محدث فقیہ نہیں ہوسکتا۔ محدثین حدیثوں کو پہچاننے کا کام کرتے ہیں اور فقیہ ان حدیثوں سے مسائل نکالتے ہیں۔

☆علم فقہ کا موضوع:۔

"انسانی اعمال وافعال میں سے ہر فعل کا حکم شرعی دلیل کے ساتھ اس طرح معلوم کرنا کہ یہ فعل جائز ہے یا ناجائز، حلال ہے یا حرام، مستحب یا مکروہ"۔

اس نہج پر مفصل دلائل کے ساتھ ایک متعین اور مخصوص معاملہ کا حکم جاننے کی سعی کامل کرنا "اجتہاد" کہلاتا ہے۔ سعی کرنے والے کو "مجتہد" کہتے ہیں۔ اور اس سعی وکوشش سے جو عملی حکم معلوم ہو یا مجموعہء احکام معلوم ہو وہ "فقہ" یا "علم الفقہ" کہلاتا ہے۔

☆غرض وغایت

فقہ کو سیکھنے کی غرض اللہ کی رضا اور اخروی نجات ہے۔

☆............☆............☆

تدوین فقه

پہلا مرحلہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں

☆ضرورت فقہ

انسان کی مکمل زندگی میں عقائد،عبادات،معاملات اور معاشرت وغیرہ سے متعلق شرعی احکام ومسائل ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ،قرآن،حدیث اور صحابہ وغیرہ کے اقوال میں بکھرے پڑے ہیں،اب ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ میں ہر مسئلہ بلاواسطہ قرآن،حدیث اورآثار صحابہ وغیرہ سے خود ہی تلاش کرلوں گا یہ ایک ناممکن اور بے حد دشوار ہے اس کے ناممکن ہونے کی وجوہات بہت ساری ہیں مثلاً:

(۱)انسان کی اپنی اپنی لامتناہی مصروفیات (۲)شریعت کے تمام احکام عربی زبان میں ہیں اور ہر انسان عربی زبان سے واقف نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے تو اس کے معانی مختلف ہونے کی وجہ سے صحیح معنی تک اس کا پہنچنا دشوار ہوتا ہے (۳)شریعت کے بعض احکام ایسے ہیں جو آیات قرآن اوراحادیثِ صحیحہ سے صراحتا ثابت ہیں لیکن بعض احکام ایسے ہیں کہ جن میں کسی قدر ابہام واجمال ہے اور بعض آیات واحادیث ایسی ہیں جو چند معانی کا احتمال رکھتی ہیں اور کچھ احکام ایسے ہیں جو بظاہر قرآن کی کسی دوسری آیت یا کسی دوسری حدیث سے متعارض معلوم ہوتی تو وہاں اجتہاد واستنباط سے کام لینا پڑتا ہے اور خود زبان نبوت سے اس کی تائید وتصویب بھی ہوتی ہے (ترمذی، باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی ،حدیث نمبر:۱۲۴۹)

کیا اجتہاد ہر ایک کرسکتا ہے؟

اور اجتہاد واستنباط ہر ایک کے بس کی بات نہیں؛ ایسے موقع پر عمل کرنے والے کے لیے الجھن اور دشواری یہ پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنا عمل شریعت کے مطابق کیسے بنائے؟ کس پر عمل کرے اور کونسا راستہ اختیار

کرے؟اسی الجھن کی وجہ سے خود صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بلاواسطہ نبی قرآن کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ چھ خاص صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاکر قرآنی تعلیمات مستقل طور پر سمجھا کرتے تھے۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر شخص قرآن وحدیث سے بغیر کسی واسطے کے کوئی مسئلہ اپنے لیے تجویز نہیں کرتا تھا بلکہ جو عالم صحابہ کرام تھے ان سے مسئلہ معلوم کرکے عمل کیا کرتا تھا اسی طرح ہر زمانہ میں ہوتا رہا۔

پھر چونکہ مکی زندگی میں آپ کے مخاطب زیادہ تر کفار ومشرکین تھے اور ابھی سب سے اہم مسئلہ ان کے دلوں میں ایمان کا پودا لگانے کا تھا؛ اس لیے زیادہ توجہ اعتقادی اور اخلاقی اصلاح کی طرف تھی، مکہ میں نبوت کے بعد آپ کا قیام بارہ سال پانچ مہینہ، تیرہ دن رہا ہے، قرآنِ مجید کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے زیادہ تر سورتیں مکہ ہی میں نازل ہوئیں؛ کیونکہ بیس سورتوں کے مدنی ہونے پر اتفاق ہے اور بارہ کے مکی یا مدنی ہونے کی بابت اختلاف ہے، باقی بیاسی سورتیں بالاتفاق مکی ہیں۔مکی زندگی میں قرآن کا خاص موضوع دعوتِ ایمان اور اصلاحِ عقیدہ تھا، ہاں بعض اُصولی احکام اور بعض متفق علیہ برائیوں کی مذمت سے متعلق ہدایاتِ زندگی میں بھی دی گئیں، جیسے قتل ناحق کی ممانعت (الانعام:۱۵۱) لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی مذمت (التکویر:8)، زنا کی حرمت (المؤمنون:۵،۷)، یتیموں کے ساتھ بدسلوکی کی ممانعت اور ناپ تول کو درست رکھنے کی ہدایات (الانعام:۸)، غیراللہ پر جانور یا نذر کی ممانعت (الانعام:136)، ان ہی جانوروں کا گوشت کھانے کی اجازت جن پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو (الانعام:118)، عبادات میں بالاتفاق "نماز" مکی زندگی میں فرض ہوچکی تھی اور زکوٰۃ کے بارے میں اختلاف ہے؛ لیکن زکوٰۃ کا ذکر مکی آیات میں بھی ملتا ہے؛ ممکن ہے کہ مکہ میں اجمالی حکم دیا گیا ہو اور مدنی زندگی میں اس کی تنفیذ عمل میں آئی ہو، عملی زندگی سے متعلق احکام عام طور پر مدنی زندگی میں ہی دیئے گئے ہیں۔

(۳) قرآنِ مجید میں جو فقہی احکام آئے ہیں، ان میں بعض اپنے منشاء ومراد کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں، جیسے: نماز، روزہ، زکوٰۃ، وغیرہ کا فرض ہونا، زنا، قتل، تہمت تراشی کی حرمت، میراث کے احکام،

نکاح میں محرم اور غیر محرم رشتہ داروں کی تعیین، یہ عقیدہ کے درجہ میں ہیں اور ان کا انکار موجب کفر ہے۔ اور بعض میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال اور اختلافِ رائے کی گنجائش ہے؛ لہٰذا ان مسائلکے استنباط میں اختلافِ رائے کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔ قرآن کا طرزِ بیان فقہی اور قانونی کتابوں جیسا نہیں ہے کہ ایک موضوع سے متعلق تمام مسائل ایک ہی جگہ ذکر کردیئے گئے ہوں؛ بلکہ قرآن میں حسب ضرورت ایک موضوع سے متعلق احکام مختلف مقامات پر آیا کرتے ہیں اور فقہی احکام کے ساتھ ترغیبات و ترہیبات اور ان احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے؛ تاکہ انسان کو اس کے تقاضے پر عمل کرنے کی رغبت ہو؛ کیونکہ قرآن مجید کا اصل مقصد ہدایت ہے۔

(۴) حدیث نبوی کے سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ رسول اللہ کی دو حیثیتیں تھیں، ایک بشری اور دوسرے نبوی؛ چنانچہ آپ کی بشری حیثیت کو قرآن نے پوری تاکید سے بیان کیا ہے:

قُل انما انا بشر مثلکم (کھف ۱۱۰) کہدو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔۔۔۔

اس حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی ہو، اس کی حیثیت حکم شرعی کی نہیں ہوگی؛ جیسا کہ آپ نے ابتداء میں اھل مدینہ کو کھجور میں "تابیر" یعنی کھجور کے مادہ درخت میں نر درخت کے ایک خاص حصہ کو ڈالنے سے منع فرمایا تھا؛ لیکن جب اس کی وجہ سے پیداوار گھٹ گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہدایت کو واپس لے لیا اور فرمایا: اَنْتُم اَعلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَا کُمْ (مسلم کتاب الفضائل) ۔تم زیادہ جانتے ہو اپنے دنیاوی معاملہ کو۔

لیکن یہ فرق کرنا بہت دشوار ہے کہ آپ کے کون سے احکام بشری حیثیت سے تھے، اس لیے جب تک اس پر کوئی واضح دلیل موجود نہ ہو، آپ کے تمام فرمودات اور معمولات کی حیثیت شرعی ہی ہوگی۔

اسی طرح آپ کے بعض افعالِ طبعی نوعیت کے ہیں، مثلاً: آپ کے استراحت کا انداز، کسی غذا کا آپ کو پسند آنا اور کسی غذا کا آپ کو پسند نہ آنا، چلنے، بیٹھنے، گفتگو کرنے، ہنسنے اور مسکرانے کی مبارک ادائیں، ان میں جن اُمور کو باختیار عمل میں لایا جاسکتا ہو، وہ بھی مستحب کے درجہ میں ہوں گے اور جو باتیں آدمی کے ارادہ و اختیار سے باہر ہیں، ان سے شرعی حکم متعلق نہیں ہوگا؛ کیونکہ حکم شرعی کا تعلق ارادہ واختیار اور قوت واستطاعت

سے ہے۔

اسی طرح بعض افعال آپ نے بطورِ وقتی تدبیر کے کیے ہیں، جیسے میدانِ جنگ میں جگہ کا انتخاب، راستہ کا انتخاب، فوجوں کی صف بندی، وغیرہ، یہ احکام بحیثیت امیر آپ کی طرف سے تھے اور اُس وقت جو صحابہ موجود تھے، ان پر اس کی اطاعت فرض تھی، آئندہ ان اُمور کے سلسلہ میں مناسب حال تدبیر کا اختیار کرنا درست ہوگا۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ اس عہد میں احکامِ شرعیہ کا اصل ماخذ تو قرآن وحدیث ہی تھا؛ لیکن آپ سے اجتہاد کرنا بھی ثابت ہے، ایک خاتون آپ کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا، ان کے ذمہ نذر کے روزے باقی تھے، کیا میں ان کی طرف سے روزے رکھ لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تمہاری ماں پر کسی کا قرض باقی ہوتا تو کیا اسے ادا کرتیں؟ انھوں نے کہا: ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کا قرض زیادہ قابل ادائیگی ہے (بخاری)

دیکھئے! یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد وقیاس سے کام لیا ہے؛ البتہ اگر آپ سے اجتہاد میں لغزش ہو جاتی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے متنبہ کر دیا جاتا؛ چنانچہ غزوہ بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ لے کر رہا کر دینے کا فیصلہ فرمایا، اس فیصلہ پر اللہ تعالی کی طرف سے تنبیہ نازل ہوئی (سورہ انفال 67-68) اسی طرح غزوہ تبوک کے موقع سے آپ نے پیچھے رہ جانے والے منافقین کی معذرت اپنے اجتہاد سے قبول کی اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہوئی۔ (التوبہ:43)

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد بھی فرمایا ہے، فرق یہ ہے کہ اگر آپ سے اجتہاد میں کوئی لغزش ہو جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر تنبیہ فرما دیا جاتا؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی نص کے حکم میں ہے۔

☆ آپ کے عہد میں صحابہ نے بھی اجتہاد کیا ہے، آپ کی عدم موجودگی میں تو کیا ہی ہے؛ کیونکہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اجازت دی تھی کہ اگر قرآن وحدیث میں حکم نہ ملے تو اجتہاد سے کام لو اور صحابہ نے آپ کے ارشاد پر عمل بھی کیا، مثلاً:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس یمن میں ایک لڑکے کے سلسلہ میں تین دعویدار پہنچے، حضرت علی نے پہلے تو ہر ایک کو راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ دوسرے کے حق میں دستبردار ہو جائے؛ لیکن جب کوئی اس پر آمادہ نہ ہوا تو قرعہ اندازی کرکے جس کے حق میں قرعہ نکلا اس کو لڑکا حوالہ کر دیا اور اس کہا کہ باقی دونوں کو ایک ایک تہائی دیت ادا کرے۔

☆............☆............☆

دوسرا مرحلہ:
فقہ اور خلافتِ راشدہ

یہ عہد ۱۱/ ہجری سے شروع ہوکر ۴۰/ ہجری پر ختم ہوتا ہے۔

(۱) اس عہد میں احکامِ شریعت کے اخذ واستنباط کا سرچشمہ قرآن مجید اور حدیثِ نبوی کے علاوہ اجماعِ اُمت اور قیاس تھا؛ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو جو خط لکھا، اس میں حسب ذیل نصیحت فرمائی: "جب کتاب اللہ میں کوئی حکم پاؤ تو اس کے مطابق فیصلہ کرو، کسی اور طرف توجہ نہ کرو؛ اگر کوئی ایسا معاملہ سامنے آئے کہ کتاب اللہ میں اس کا حکم نہ ہو، تو رسول اللہ کی سنت کے مطابق فیصلہ کرو؛ اگر کتاب اللہ میں نہ ملے اور نہ سنتِ رسول میں، تو جس بات پر لوگوں کا اجماع ہو اس کے مطابق فیصلہ کرو، نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ سنتِ رسول میں اور نہ تم سے پہلوں نے اس سلسلہ میں کوئی رائے ظاہر کی ہو، تو اگر تم اجتہاد کرنا چاہو تو اجتہاد کے لیے آگے بڑھو اور اس سے پیچھے ہٹنا چاہو، تو پیچھے ہٹ جاؤ اور اس کو میں تمہارے حق میں بہتر ہی سمجھتا ہوں"۔

(۲) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی اس بات کے لیے کوشاں رہتے تھے کہ جن مسائل کے بارے میں قرآن وحدیث کی کوئی نص موجود نہ ہو، ان میں اہم شخصیتوں کو جمع کیا جائے اور ان سے مشورہ کیا جائے اور اگر وہ کسی بات پر متفق ہو جائیں تو اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے (سنن دارمی:۱/ ۳۵) چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جو اتفاق ہوا، وہ آپ ہی کی پہل پر، اسی طرح بعض مسائل پر اجماع منعقد ہونے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سعی کو دخل رہا ہے، جیسے مانعین زکوٰۃ سے جہاد، رسول اللہ کی متروکات میں میراث کا جاری نہ ہونا، رسول اللہ کا آپ کی جائے وفات پر دفن کیا جانا، قرآن مجید کی جمع وترتیب، وغیرہ۔

(۳) چونکہ رسول اللہ کے بعد غیر منصوص مسائل میں اجتہاد کے سوا چارہ نہیں تھا؛ اس لیے صحابہ کے درمیان اختلافِ رائے بھی پیدا ہوا، بعض مواقع پر کوشش کی گئی کہ لوگوں کو ایک رائے پر جمع کیا جائے؛ لیکن اس

کے باوجود نقاطِ نظر کا اختلاف باقی رہا، صحابہ کا مزاج یہ تھا کہ وہ اس طرح کے اختلافات کو مذموم نہیں سمجھتے تھے اور پورے احترام اور فراخ قلبی کے ساتھ دوسرے کو اختلاف کا حق دیتے تھے، اس کی چند مثالیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

صحابہ کے اختلاف کی چند مثالیں

☆ حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک بیوہ حاملہ عورت کی عدت ولادت تک تھی اور غیر حاملہ کی چار مہینے دس روز، حضرت علی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ولادت اور چار ماہ دس دنوں میں سے جو مدت طویل ہو وہ عدتِ وفات ہوگی۔ حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے نزدیک مطلقہ عورت کی عدت تیسرے حیض کے غسل کے بعد پوری ہوتی تھی اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نزدیک تیسرا حیض شروع ہوتے ہی عدت پوری ہو جاتی تھی۔

☆ حضرت ابوبکر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ باپ کی طرح دادا بھی سگے بھائیوں کو میراث سے محروم کر دے گا، حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس سے اختلاف تھا۔

☆ ایک بڑا اختلاف عراق و شام کی فتوحات کے وقت پیدا ہوا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مالِ غنیمت کے عام اُصول کے مطابق اسے مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کی رائے تھی کہ اسے بیت المال کی ملکیت میں رکھا جائے؛ تاکہ تمام مسلمانوں کو اس سے نفع پہنچے اور طویل بحث و مباحثہ کے بعد اسی پر فیصلہ ہوا۔

☆ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ یہ تھا کہ خلع حاصل کرنے والی عورت پر عدت واجب نہیں، صرف فراغتِ رحم کو جاننے کے لیے ایک حیض گذارنا ضروری ہوگا، دوسرے صحابہ مکمل عدت گذارنے کو واجب قرار دیتے تھے۔ اس طرح کے بیسیوں اختلاف عہدِ صحابہ میں موجود تھے، کتبِ فقہ اور خاص کر شروحِ حدیث

ان کی تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔اس سے مختلف صحابہ کی فقہ اوران کا فقہی ذوق اور منہج استنباط واضح طور پر سامنے آتا ہے۔

(۴) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو بعض اختلافی مسائل میں ایک رائے پر جمع کرنے کی خاص طور پر کوشش فرمائی؛ چنانچہ بعض مسائل پر اتفاق رائے ہوگیا اور جن میں اتفاق نہیں ہوسکا،ان میں بھی کم سے کم جمہور ایک نقطہ نظر پر آگئے،ان میں سے چند مسائل یہ ہیں:

☆اس وقت تک شراب نوشی کی کوئی سزا متعین نہیں تھی،حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں اکابر صحابہ سے مشورہ کیا،حضرت علی نے فرمایا کہ جب کوئی شخص شراب پیتا ہے تو نشہ میں مبتلا ہوتا ہے؛ پھر نشہ کی حالت میں ہذیان گوئی شروع کرتا ہے اور اسمیں لوگوں پر بہتان تراشی بھی کرگزرتا ہے؛اس لیے جو سزا تہمت اندازی (قذف) کی ہے،یعنی اسی (۸۰) کوڑے،وہی سزا شراب نوشی پر بھی دے دی جانی چاہئے؛چنانچہ اسی پر فیصلہ ہوا (مؤطا امام مالک، حدیث نمبر:۷۰۹) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے بھی اسی (۸۰) کوڑے کا مشورہ دیا تھا۔

☆اگر کوئی شخص لفظ بتہ کے ذریعہ طلاق دے،تو اس میں ایک طلاق کا معنی بھی ہوسکتا ہے اور تین طلاق کا بھی؛ چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ طلاق دینے والے کی نیت کے مطابق فیصلہ کیا جاتا تھا،حضرت عمر کا احساس یہ تھا کہ بعض لوگ اس گنجائش سے غلط فائدہ اُٹھاتے ہیں اور غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ میری نیت ایک طلاق کی تھی،اس لیے انھوں نے اس کے تین طلاق ہونے کا فیصلہ فرمایا۔

☆رسول اللہ سے نمازِ تراویح کی رکعات کی تعداد صحیح طور پر ثابت نہیں ہے؛ کیونکہ آپ نے اس نماز کے واجب ہوجانے کے اندیشے سے دو تین شب کے علاوہ صحابہ کے سامنے یہ نماز ادا نہیں فرمائی،مختلف لوگ تنہا تنہا پڑھ لیتے تھے،حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک جماعت بنادی،ان پر حضرت ابی بن کعبرضی اللہ عنہ کو امام مقرر کیا اور تراویح کی بیس رکعتیں مقرر فرمادیں،جو آج تک متوارثاً چلا آرہا ہے۔

(۵) صحابہ اور خاص کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض فیصلے شریعت کی مصلحت اور اس کے عمومی مقاصد کو سامنے رکھ کر بھی کیئے ہیں،جیسے:

☆حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں "مؤلفۃ القلوب" جو زکوٰۃ کی ایک اہم مد ہے، کو روک دیا تھا؛ کیونکہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور اسلام کی شوکت قائم ہوگئی تھی لہٰذا ان کے خیال میں اب اس مد کی ضرورت باقی نہیں تھی۔

☆حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک شدید قحط پڑا کہ لوگ اضطرار کی کیفیت میں مبتلا ہوگئے، اس زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چوری کی سزا موقوف فرمادی، اسی طرح حضرت حاطب بن بلتعہ کے غلاموں نے قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کی اُونٹنی چوری کرلی، آپ رضی اللہ عنہ نے ان غلاموں کے ہاتھ نہیں کاٹے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اس وقت لوگ حالتِ اضطرار میں ہیں اور اضطراری حالت میں چوری کرنے سے حد جاری نہیں ہوگی؛ کیونکہ انسان اختیاری افعال کے بارے میں جواب دہ ہے، نہ کہ اضطراری افعال کے بارے میں۔

☆حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھٹکی ہوئی اُونٹنی کو پکڑنے سے منع فرمایا؛ کیونکہ وہ خود اپنی حفاظت کرسکتی ہے؛ یہاں تک کہ اُس کا مالک اُس کو پالے، حضرت ابوبکر وعمر کے دور میں اسی پر عمل رہا، لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں ایسی اُونٹنی کو پکڑ لینے اور بیچ کر اس کی قیمت کو محفوظ رکھنے کا حکم دیا تا آنکہ اس کا مالک آجائے (شرح الزرقانی علی الموٴطا لمالک:3\129) کیونکہ اخلاقی انحطاط کی وجہ سے اس بات کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ بدقماش لوگ ایسی اونٹنی کو پکڑلیں، گویا منشا اونٹنی کی حفاظت تھا، طریقہ کار، زمانہ کے حالات کے لحاظ سے بدل گیا۔

☆اسی طرح اگر کوئی شخص مرضِ وفات میں اپنی بیوی کو طلاق بائن دے دے، تو شریعت کے عمومی اُصول کا تقاضا تو یہی تھا کہ مطلقہ کو اس مرد سے میراث نہ ملے؛ لیکن چونکہ اس کو بعض غیر منصف مزاج لوگ بیوی کو میراث سے محروم کرنے کا ذریعہ بناسکتے تھے، اس لیے صحابہ نے ظلم کے سد باب کی غرض سے ایسی مطلقہ کو بھی مستحق میراث قرار دیا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا خیال تو یہ تھا کہ اگر عدت ختم ہونے کے بعد شوہر کی موت ہو، تب بھی عورت وارث ہوگی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ عدت کے اندر شوہر کی وفات کی صورت میں عورت کو میراث ملے گی۔

☆اسی طرح امن وامان اور حفاظتِ جان کی مصلحت کے پیشِ نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر ایک شخص کے قتل میں ایک جماعت شریک ہوتو تمام شرکا قتل کئے جائیں گے۔

(٦) صحابہ فروعی مسائل میں اختلاف رائے کو برانہیں سمجھتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے، ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز ادا کرتے تھے؛ اگر کوئی شخص سوال کرنے آئے تو ایک دوسرے کے پاس تحقیق مسئلہ کے لیے بھیجتے تھے اور اپنی رائے پر شدت نہ اختیار کرتے تھے، حضرت عمر سے ایک صاحب ملے اور حضرت علی اور زید بن ثابت کا فیصلہ انھیں سنایا، حضرت عمر نے سن کر کہا: کہ اگر میں فیصلہ کرتا تو اس کے برخلاف اس طرح کرتا، ان صاحب نے کہا کہ آپ کو تو اس کا حق اور اختیار حاصل ہے؛ پھر آپ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ فرمادیں، حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر میرے پاس اللہ، رسول کا حکم ہوتا تو میں اس کو نافذ کر دیتا؛ لیکن میری بھی رائے ہے اور رائے میں سب شریک ہیں؛ چنانچہ انھوں نے حضرت علی اور حضرت زید کے فیصلہ کو برقرار رکھا:" (اعلام الموقعین :١/ ٤٥)

فقہاء صحابہ کے درمیان اختلافِ رائے کے مختلف اسباب

(١) قرآن وحدیث کے کسی لفظ میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال، جیسے قرآن نے تین " قرؤ" کو عدت قرار دیا ہے " قرؤ کے معنی حیض کے بھی ہیں اور طہر کے بھی؛ چنانچہ حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم نے اس سے حیض کا معنی مراد لیا اور حضرت عائشہ، حضرت زید بن ثابت نے طہر کا۔

(٢) بعض احادیث ایک صحابی تک پہنچی اور دوسرے تک نہیں پہنچی، جیسے جدہ کی میراث کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر اس بات سے واقف نہیں تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چھٹا حصہ دیا ہے، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مسلم نے شہادت دی کہ حضور نے دادی کو چھٹا حصہ دیا ہے؛ چنانچہ اسی پر فیصلہ ہوا۔

(٣) بعض دفعہ حضور کے کسی عمل کا مقصد ومنشا متعین کرنے میں اختلافِ رائے ہوتا تھا، جیسے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ طواف میں رمل کا عمل آپ نے مشرکین کی تردید کے لیے فرمایا، جو کہتے تھے کہ مدینہ کے بخار نے مسلمانوں کو کمزور کر کے رکھ دیا ہے، یہ آپ کی مستقل سنت نہیں، دوسرے صحابہ اس کو مستقل قرار دیتے تھے۔

☆ حج میں منی سے مکہ لوٹتے ہوئے وادی ابطح میں توقف، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عائشہ اسے سنت نہیں سمجھتے تھے اور اس کو حضور کا ایک طبعی فعل قرار دیتے تھے کہ اس کا مقصد آرام کرنا تھا؛ لیکن دوسرے صحابہ اسے سنت قرار دیتے تھے۔ جن مسائل میں کوئی نص موجود نہ ہوتی اور اجتہاد سے کام لیا جاتا، ان میں نقطہ نظر کا اختلاف پیدا ہوتا تھا مثلاً:

☆ اگر کوئی مرد کسی عورت سے عدت کے درمیان نکاح کرلے، تو حضرت عمر بطورِ سرزنش اس عورت کو ہمیشہ کے لیے اس مرد پر حرام قرار دیتے تھے اور حضرت علی کی رائے یہ تھی کہ دونوں میں تفریق کردی جائے اور سرزنش کی جائے؛ لیکن اس کی وجہ سے ان دونوں مرد وعورت کے درمیان دائمی حرمت پیدا نہیں ہوگی۔

☆ اسی طرح حضرت ابوبکر کا طریقہ یہ تھا کہ بیت المال میں جو کچھ آتا، اسے تمام مسلمانوں پر مساوی تقسیم فرماتے اور حضرت عمر نے اپنے زمانہ میں برابر تقسیم کرنے کے بجائے لوگوں کے درجہ ومقام اور اسلام کے لیے ان کی خدمات کو سامنے رکھ کر تقسیم کرنا شروع کیا۔

(۴) غور کیا جائے! تو صحابہ کے درمیان اختلاف رائے کا ایک سبب ذوق اور طریقہ استنباط کا فرق بھی تھا، بعض صحابہ کا مزاج حدیث کے ظاہری الفاظ پر قناعت کا تھا، جیسے حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ۔ جبکہ بعض صحابہ حدیث کے مقصد ومنشاء پر نظر رکھتے تھے اور قرآن مجید اور دین کے عمومی مزاج و مذاق کی کسوٹی پر اسے پرکھنے کی کوشش کرتے تھے، حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے، چند مثالوں سے اس کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے:

☆ حضرت فاطمہ بنت قیس نے روایت کیا کہ مطلقہ بائنہ عدت میں نہ نفقہ کی حق دار ہے، نہ رہائش کی، حضرت عمر نے سنا تو اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور فرمایا کہ میں ایک عورت کی بات پر نہ معلوم کہ اس

نے یاد رکھا یا بھول گئی، کتاب اللہ اور سنتِ رسول کو نہیں چھوڑ سکتا، حضرت عمر کو خیال تھا کہ یہ فاطمہ بنت قیس کا وہم ہوسکتا ہے؛ کیونکہ قرآن سورہ طلاق آیت ۱ میں مطلقہ کے لیے رہائش فراہم کرنے کی ہدایت موجود ہے۔

☆حضرت عبداللہ بن عمر نے روایت کیا کہ مردہ کو اس کے لوگوں کے اس پر رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے، حضرت عائشہ نے اس پر نکیر فرمائی اور کہا کہ یہ قرآن کے حکم "ولا تزر وازرۃ وزر اُخری (فاطر ۱۸) یعنی "ایک شخص پر دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں ہوگا" کے خلاف ہے۔

☆حضرت ابوہریرہ نے روایت کیا کہ جنازہ کو اُٹھانے والے پر وضو واجب ہے، حضرت عبداللہ بن عباس نے سوال کیا کہ کیا سوکھی ہوئی لکڑیوں کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ اس طرح کی بہت سی مثالیں صحابہ کے درمیان باہمی مناقشات کی پائی جاتی ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ مسائل شرعیہ کو اخذ کرنے کے سلسلہ میں دونوں طرح کا ذوق پایا جاتا تھا اور یہی ذوق بعد کو فقہاء مجتہدین تک منتقل ہوا اور اس کی وجہ سے الگ الگ فقہ وجود میں آئے۔

(۵) اس عہد میں سب سے اہم کام حضرت ابوبکر کے عہدِ خلافت میں سرکاری طور پر قرآن مجید کی جمع وتدوین کا اور حضرت عثمان غنی کے دور میں قرات قریش پر مصحفِ قرآنی کی کتابت اور اس کی اشاعت کا کام ہوا، حضرت عمر کے دل میں جمع احادیث کا داعیہ بھی پیدا ہوا؛ لیکن انھوں نے کافی غور وفکر اور تقریباً ایک ماہ استخارہ کرنے کے بعد اس کا ارادہ ترک کردیا کہ کہیں یہ قرآن مجید کی طرف سے بے توجہی اور بے التفاتی کا سبب نہ بن جائے۔(تاریخ التشریع الاسلامی لخضری بک:۱۷۱)

(۶) یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ صحابہ سب کے سب فقیہ ومجتہد تھے؛ بلکہ ایک محدود تعداد ہی اس جانب متوجہ تھی؛ کیونکہ استعداد وصلاحیت کے فرق کے علاوہ دین کے بہت سے کام اور وقت کے بہت سے تقاضے تھے اور سب کے لیے افرادِ کار کی ضرورت تھی، علامہ ابن قیم نے ان صحابہ کا ذکر کیا ہے، جن سے فتاویٰ منقول ہیں، مرد وخواتین کو لیکر ان کی تعداد 130 بنتی ہے؛ پھر ان کے تین گروہ کیئے ہیں، ایک وہ جن سے بہت زیادہ فتاویٰ منقول ہیں، ان کی تعداد سات ہے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ　　حضرت علی رضی اللہ عنہ　　حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا　　حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ　　حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ۔

خلیفہ مامون کے پڑپوتے ابوبکر محمد نے صرف حضرت عبداللہ بن عباس کے فتاویٰ کو جمع کیا تو ان کی بیس جلدیں ہوئیں۔

بیس صحابہ متوسطین میں شمار کئے گئے ہیں، جن سے بہت زیادہ نہیں؛ لیکن مناسب تعداد میں فتاویٰ منقول ہیں اور بقول ابنِ قیم رحمہ اللہ ان کے فتاویٰ کو ایک چھوٹے جزء میں جمع کیا جاسکتا ہے، حضرت ابوبکر، حضرت عثمان، حضرت اُم سلمہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہ اسی گروہ میں ہیں۔

بقیہ صحابہ وہ ہیں جن سے ایک دو مسئلہ میں فتویٰ دینا منقول ہے، ان کی تعداد (125) ہے؛ اسی گروہ میں حضرت حسن وحسین، سیدالنساء حضرت فاطمہ، حضرت حفصہ، حضرت صفیہ، حضرت اُم حبیبہ، حضرت میمونہ، حضرت بلال، حضرت عباد اور حضرت اُمِ ایمن رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں۔ (دیکھئے اعلام الموقعین: ۱/۲۱۔۴۱)

☆............☆............☆

تیسرا مرحلہ :

اصاغر صحابہ اور اکابر تابعین

یہ مرحلہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت سے شروع ہوتا ہے اور بنواُمیہ کی حکومت کے خاتمہ کے قریبی زمانہ تک کا احاطہ کرتا ہے، اس عہد میں بھی بنیادی طور پر اجتہاد واستنباط کا وہی منہج رہا جو صحابہ نے اختیار کیا تھا، اس عہد کی چند خصوصیات قابل ذکر ہیں:

(۱) فقہاء صحابہ کسی ایک شہر میں مقیم نہیں رہے بلکہ مختلف شہروں میں مختلف صحابہ کا ورود ہوا، وہاں لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور اس شہر میں ان کی آراء اور فتاویٰ کو قبولیت حاصل ہوئی:

مدینہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

مکہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے تلامذہ مجاہد بن جبیر، عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان،

کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگردانِ باتوفیق، علقمہ نخعی، اسود بن یزید اور ابراہیم نخعی،

بصرہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، حضرت حسن بصری، حضرت انس بن مالک اور ان کے شاگرد محمد بن سیرین،

شام میں حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبادہ بن صامت رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین۔

اور ان صحابہ سے استفادہ کرنے والے تابعین، ابوادریس خولانی؛ اسی طرح مصر میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور ان کے بعد یزید بن حبیب وغیرہ کے فتاویٰ کو بقول حاصل ہوا۔ (اعلام الموقعین:۱/۱۲)

(۲) صحابہ اور فقہاءِ تابعین کے مختلف شہروں میں مقیم ہونے کی وجہ سے فقہی مسائل میں اختلا فاف کی بھی کثرت ہوئی؛ کیونکہ ایک تو خلافتِ راشدہ میں خاص کر حضرت عثمان غنی کی شہادت تک اہل علم یکجا تھے

یاایک دوسرے سے قریب واقع تھے،اس کی وجہ سے بہت سے مسائل میں اتفاق رائے ہوجاتا تھا، اب عالم اسلام کا دائرہ وسیع ہوجانے ، دور دراز شہروں میں مقیم ہونے اور ذرائع ابلاغ کے مفقود ہونے کی وجہ سے اجتماعی اجتہاد کی جگہ انفرادی اجتہاد کا غلبہ تھا، دوسرے مختلف شہروں کے حالات، رواجات، کاروباری طریقے اورلوگوں کے فکری وعملی رجحانات بھی مختلف تھے،اس اختلاف کا اثر مختلف شہروں میں بسنے والے فقہاء کے نقطہ نظر پر بھی پڑتا تھا؛اس لیے بمقابلہ گذشتہ ادوار کے،اس دور میں اختلافِ رائے کی کثرت ملتی ہے۔

(۳) یوں تو اکابرِ صحابہ میں بھی دونوں طرح کے فقہاء پائے جاتے تھے،ایک وہ جن کی نگاہ حدیث کے ظاہری الفاظ پر ہوتی تھی، دوسرے وہ جو معانی حدیث کے غواص تھے اور احکامِ شرعیہ میں شریعت کی مصالح اورلوگوں کے احوال کوبھی پیشِ نظر رکھتے تھے،تابعین کے عہد میں یہ دونوں طریقہ اجتہاد اوران کے طرزِ استنباط کا تفاوت زیادہ نمایاں ہوگیا، جولوگ ظاہر حدیث پر قانع تھے وہ "اصحاب الحدیث" کہلائے اور جونصوص اور ان کے مقاصد ومصالح کوسامنے رکھ کر رائے قائم کرتے تھے وہ "اصحاب الرائے" کہلائے،اصحاب الحدیث کا مرکز مدینہ تھا اور اصحاب الرحائے کا عراق اور خاص طور پر عراق کا شہر کوفہ، گومدینہ میں بعض ایسے اہل علم موجود تھے، جواصحاب الرائے کے طریقہ استنباط سے متاثر تھے،جیسے امام مالک کے استاذ ربیعہ بن عبدالرحمٰن، جواصحاب الرائے کے طرزِ استنباط میں ماہر ہونے سے "ربیع الرای" کہلائے اور "رائی" ان کے نام کا جزوٹھہرا؛ اسی طرح کوفہ میں امام عامر شراحیل شعبی جوامام ابوحنیفہ کے اساتذہ میں ہیں؛لیکن ان کا منہج اصحاب الحدیث کا تھا۔اصحاب الرائی اور اصحاب الحدیث کے درمیان دواُمور میں نمایاں فرق تھا،ایک یہ کہ اصحاب الحدیث کسی حدیث کوقبول اور رد کرنے میں محض سند کی تحقیق کوکافی سمجھتے تھے اور خارجی وسائل سے کام نہیں لیتے تھے،اصحاب الرائے اُصولِ روایت کے ساتھ اُصولِ درایت کوبھی ملحوظ رکھتے تھے، وہ حدیث کوسند کے علاوہ اس طور پر بھی پرکھتے تھے کہ وہ قرآن کے مضمون سے ہم آہنگ ہے یااس سے متعارض؟ دین کے مسلمہ اُصول اور مقاصد کے موافق ہے یانہیں؟ دوسری مشہور حدیثوں سے متعارض تونہیں ہے؟ صحابہ کا اس حدیث پرعمل تھا یانہیں؟ اورنہیں تھا تواس کے اسباب کیا ہوسکتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اصحاب الرائی کا منہج زیادہ درست بھی تھا اور دشوار بھی۔

دوسرا فرق یہ تھا کہ اصحاب الحدیث ان مسائل سے آگے نہیں بڑھتے تھے جو حدیث میں مذکور ہوں؛ یہاں تک کہ بعض اوقات کوئی مسئلہ پیش آجاتا اور ان سے اس سلسلہ میں رائے دریافت کی جاتی؛ اگر حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہوتا تو وہ جواب دینے سے انکار کرجاتے اور لوگ ان کی رہنمائی سے محروم رہتے، ایک صاحب سالم بن عبداللہ بن عمر کے پاس آئے اور ایک مسئلہ دریافت کیا؛ انھوں نے نے کہا کہ میں نے اس سلسلہ میں کوئی حدیث نہیں سنی، استفسار کرنے والے نے کہا کہ آپ اپنی رائے بتائیں؛ انھوں نے انکار کیا، اس نے دوبارہ استفسار کیا اور کہا کہ میں آپ کی رائے پر راضی ہوں، سالم نے کہا کہ اگر اپنی رائے بتاؤں تو ہوسکتا ہے کہ تم چلے جاؤ اس کے بعد میری رائے بدل جائے اور میں تم کو نہ پاؤں۔(تاریخ الفقہ الاسلامی، للشیخ محمد علی السایس:۷۷)

یہ واقعہ ایک طرف ان کے احتیاط کی دلیل ہے؛ لیکن سوال ہے کہ کیا ایسی احتیاط سے اُمت کی رہنمائی کا حق ادا ہوسکتا ہے؟ اصحاب الرائی نہ صرف یہ کہ جن مسائل میں نص موجود نہ ہوتی، ان میں مصالح شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کرتے؛ بلکہ جو مسائل ابھی وجود میں نہیں آئے؛ لیکن ان کے واقع ہونے کا امکان ہے، ان کے بارے میں بھی پیشگی تیاری کے طور پر غور کرتے اور اپنی رائے کا اظہار کرتے، اسی کو "فقہ تقدیری" کہتے ہیں۔

فقہ تقدیری کا پھل

اصحاب حدیث اصحاب الرائی کے اس طرزِ عمل پر طعنہ دیتے تھے؛ لیکن آج اسی فقہ تقدیری کا نتیجہ ہے کہ نئے مسائل کو حل کرنے میں قدیم ترین فقہی ذخیرہ سے مدد مل رہی ہے۔اس وضاحت سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اصحاب الرائی کا کام بمقابلہ اصحاب الحدیث کے زیادہ دُشوار تھا؛ اسی لیے متقدمین کے یہاں "اصحاب الرائی" میں سے ہونا ایک قابل تعریف بات تھی اور مدح سمجھی جاتی تھی، بعد کو جن لوگوں نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا؛ انھوں نے رائے سے مراد ایسی رائے کو سمجھا جو قرآن وحدیث کے مقابلہ خود رائی پر مبنی ہو، یہ کھلی ہوئی غلط فہمی اور نا سمجھی ہے۔حجاز کا اصحاب الحدیث کا مرکز بننا اور عراق کا اصحاب الرائی کا مرکز بننا کوئی

اتفاقی امر نہیں تھا، اس کے چند بنیادی اسباب تھے،

اوّل یہ کہ حجاز عرب تہذیب کا مرکز تھا، عرب اپنی سادہ زندگی کے لیے مشہور رہے ہیں، ان کی تہذیب میں بھی یہی سادگی رچی بسی تھی، عراق ہمیشہ سے دُنیا کی عظیم تہذیبوں کا مرکز رہا ہے اور زندگی میں تکلفات وتعیّشات اس تہذیب کا جزو تھا؛ پھر مسلمانوں کے زیرنگین آنے کے بعد یہ علاقہ عربی اور عجمی تہذیب کا سنگم بن گیا تھا؛ اس لیے بمقابلہ حجاز کے یہاں مسائل زیادہ پیدا ہوتے تھے اور دین کے عمومی مقاصد ومصالح کو سامنے رکھ کر اجتہاد سے کام لینا پڑتا تھا؛ یہاں کے فقہاء اگر علمائے اصحاب حدیث کی طرح منصوص مسائل کے آگے سوچنے کو تیار ہی نہ ہوتے تو آخر اُمت کی رہنمائی کا فرض کیوں کر ادا ہوتا؟۔

دوسرے حجاز پر حضرت عبداللہ بن عمرو غیرہ صحابہ کی چھاپ تھی، جن کا ذوق ظاہر نص پر قناعت کرنے کا تھا اور عراق کے استاذ اول حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے فقہاء تھے، جن پر اصحاب الرائی کے طریقہ اجتہاد کا غلبہ تھا، اس لیے دونوں جگہ بعد کے علماء پر ان صحابہ کے اندازِ فکر کی چھاپ گھری ہوتی چلی گئی۔

تیسرے اکثر فرقِ باطلہ کا مرکز عراق ہی تھا، یہ لوگ اپنی فکر کی اشاعت کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے، اس لیے علماء عراق تحقیق حدیث میں اُصول روایت کے ساتھ ساتھ اُصولِ درایت سے کام لیتے تھے، اس کے برخلاف علماء حجاز کو وضع حدیث کے اس فتنہ سے نسبتاً کم سابقہ تھا۔

(۴) اسی دور میں فرقِ باطلہ کا ظہور ہوا اور سیاسی اختلاف نے آہستہ آہستہ مذہبی رنگ اختیار کرلیا، ایک طرف شیعانِ علی تھے جو اہل بیت کو ہی خلافت کا مستحق جانتے تھے اور چند صحابہ کو چھوڑ کر تمام ہی صحابہ کی تکفیر کیا کرتے تھے، دوسری طرف ناصبیہ تھے، جو اہل بیت پر بنواُمیہ کے ظلم وجور کو سند جواز عطا کرتے تھے اور حضرت علی اور اہلِ بیت کو برا بھلا کہنے سے بھی نہیں چوکتے تھے؛ تاہم ناصبیہ کی تعداد بہت کم تھی اور انھیں کبھی کسی طبقہ میں قبول حاصل نہیں ہوا، تیسرا گروہ خوارج کا تھا، جو حضرت عثمان غنی، حضرت علی، حضرت معاویہ اور بعد کے تمام صحابہ کو کافر قرار دیتا تھا، شیعہ اور خوارج کا مرکز عراق اور مشرق کا علاقہ تھا؛ حالانکہ اس اختلاف کی بنیاد سیاسی تھی؛ لیکن چونکہ لوگوں کے ذہن پر مذہب کی گرفت بہت مضبوط تھی، اس لیے جلد ہی اس اختلاف نے عقیدہ کی صورت اختیار کرلی اور اس کو تقویت پہنچانے کے لیے لوگوں نے روایتیں گھڑنی شروع کردیں؛

پس اسی دور سے وضع حدیث کا فتنہ بھی شروع ہوا۔

(۵) عہد صحابہ میں اکثر لوگ وہ تھے؛ جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؛ اس لیے روایت حدیث کی ضرورت کم پیش آتی تھی، اب چونکہ زیادہ تر صحابہ رخصت ہو چکے تھے اور دوسری طرف فرقِ باطلہ کے نمائندوں نے اپنی طرف سے حدیثیں گھڑنی شروع کردی تھیں، اس لیے روایتِ حدیث کے سلسلہ میں بمقابلہ گذشتہ دور کے اضافہ ہوگیا۔

(۶) البتہ اس دور میں حدیث یا فقہ کی باضابطہ تدوین عمل میں نہ آئی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس سلسلہ میں کوشش تو کی اور گورنر مدینہ ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم کو اس کام کی طرف متوجہ کیا؛ لیکن اس سے پہلے کہ ابن حزم اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرتے، خود حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی وفات ہوگئی۔

(۷) اس دور کے اہم فقہاء وارباب افتاء کے نام اس طرح ہیں:

مدینہ: اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوہریرہ، سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام، امام زین العابدین علی بن حسین، عبداللہ بن مسعود، سالم بن عبداللہ بن عمر، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد بن ابوبکر، نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر، محمد بن مسلم ابن شہاب زہری، امام ابوجعفر محمد باقر، ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان، یحییٰ بن سعید انصاری، ربیع الرائے رضی اللہ عنہم اجمعین۔

مکہ: حضرت عبداللہ بن عباس، امام مجاہد، عکرمہ، عطاء بن ابی رباح۔

کوفہ: علقمہ نخعی، مسروق، عبید بن عمرو سلمانی، اسود بن یزید نخعی، قاضی شریح، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، عامر بن شراحیل شعبی رحمہم اللہ۔

بصرہ: حضرت انس بن مالک انصاری، ابوالعالیہ، رفیع بن مہران، حسن بن ابی الحسن یسار، ابوالشعثاء، جابر بن زید، محمد بن سیرین، قتادہ رحمہم اللہ۔

شام: عبدالرحمٰن بن غانم، ابوادریس خولانی، مکحول، قبیصہ بن ذویب، رجاء بن حیوٰہ، حضرت عمر بن

عبدالعزیز رحمہم اللہ۔

مصر: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، مرثد بن عبداللہ بن البزی، یزید بن ابی حبیب رحمہم اللہ۔

یمنل: طاؤس بن کیسان، وہب بن منبہ صنعانی، یحییٰ بن ابی کثیر۔

☆............☆............☆

چوتھا مرحلہ:

دوسری صدی تا نصف چوتھی صدی

چوتھا مرحلہ اوائل دوسری صدی تا نصف چوتھی صدی تدوین فقہ کا چوتھا مرحلہ جو عباسی دور کی ابتداء سے شروع ہو کر چوتھی صدی ہجری کے وسط تک محیط ہے، نہایت اہم ہے اور اسے نہ صرف فقہ اسلامی بلکہ تمام ہی اسلامی وعربی علوم وفنون کا سنہرا دور کہہ سکتے ہیں۔

فقہ اور فقہ سے متعلق جو علوم ہیں ان کے علاوہ اسی عہد میں تفسیر قرآن کے فن کو کمال حاصل ہوا اور تفسیر طبری جیسی عظیم الشان تفسیر وجود میں آئی، جو آج تک کتبِ تفسیر کا نہایت اہم مرجع ہے؛ اسی عہد میں عربی زبان کے قواعد مرتب ہوئے؛ اسی دور میں عباسی خلفاء کی خواہش پر یونانی علوم، منطق اور فلسفہ وغیرہ عربی زبان میں منتقل کیا گیا اور اس کو بنیاد بنا کر مسلمان محققین نے بڑے بڑے سائنسی کارنامے انجام دیئے اور علم وتحقیق کی دنیا میں اپنی فتح مندی کے علم نصب کئے اور فقہ کے لیے تو یہ دور نہایت ہی اہم ہے۔

اس دور کی چند اہم خصوصیات اس طرح ہیں:

(۱) یوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی سے حدیث کی جمع وکتابت کا کام شروع ہو چکا تھا؛ لیکن کتابی انداز پر اس کی ترتیب عمل میں نہیں آئی تھی؛ بلکہ مختلف لوگوں نے اپنی اپنی یادداشتیں لکھ رکھی تھیں، سب سے پہلے احادیث کو باضابطہ طور پر جمع کرنے کا خیال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اور ان کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحم اللہ علیہ کو آیا؛ لیکن حضرت عمر نے اسے مناسب نہ سمجھا اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اس کام کی تکمیل سے پہلے ہی وفات ہوگئی، اب عباسی دور میں باضابطہ حدیث کی تدوین کا کام شروع ہوا۔ یہ تدوین تین مرحلوں میں انجام پائی

۱۔ پہلے مرحلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے فتاویٰ اور فیصلے؛ بلکہ کہیں کہیں تابعین کے فتاویٰ بھی ملے جلے جمع کئے گئے، امام ابویوسف اور امام محمد رحمہ اللہ کی کتاب الآثار اور امام مالک

رحمہ اللہ کی مؤطا میں آج بھی اس طریقہ ترتیب کوملاحظہ کیا جاسکتا ہے؛

۲۔پھر دوسری صدی ہجری کے آخر میں مسانید کا طریقہ مروج ہوا کہ راوی پنی تمام مرویات کوصحابہ کے ناموں کی ترتیب سے جمع کرتا اور حدیث کے مضامین وموضوعات سے قطع نظر ایک صحابی کی تمام مرویات ایک جگہ ذکر کی جاتیں، اس سلسلہ کی سب سے ممتاز کتاب "مسند امام احمد بن حنبل" ہے؛ لیکن ان میں صحیح ومستند اورضعیف ونامعتبر دونوں طرح کی روایتیں مذکور ہوتیں؛

۳۔چنانچہ تیسری صدی ہجری میں دواُمور کی رعایت کے ساتھ کتب حدیث مرتب کی گئیں، ایک یہ کہ ان کی ترتیب مضمون کے اعتبار سے ہواور فقہی ابواب کی ترتیب پر روایتیں جمع کی جائیں، دوسرے یہ کہ نقل حدیث میں صحیح وضعیف کا فرق ملحوظ رکھا جائے اوراپنے گمان کے مطابق صحیح روایتیں نقل کی جائیں، صحاحِ ستہ؛ اسی دور کی یادگاریں ہیں، جن کوکتبِ حدیث میں خاص طور پر قبولِ عام اورشہرت ودوام حاصل ہوا۔اس وقت جوکتبِ حدیث موجود ہیں، ان میں امام ابویوسف رحمہ اللہ کی کتاب الآثار، امام مالک رحمہ اللہ کی مؤطا اورامام محمد رحمہ اللہ کی مؤطا اور کتاب الآثار سب سے قدیم کتابیں ہیں، باقی بہت سی کتابیں وہ ہیں کہ ان کے مصنفین کی نسبت سے تاریخ کی کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے؛ لیکن اب دستیاب نہیں ہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مسند گوایک قدیم ترین مسند ہے؛ لیکن یہ ان کے تلامذہ کی جمع کی ہوئی ہے نہ کہ خود امام صاحب رحمہ اللہ کی۔

(۲) چونکہ تدوین حدیث کے شانہ بشانہ بلکہ اس سے پہلے ہی گمراہ فرقوں اور خداناترس افراد واشخاص کی طرف سے وضع حدیث کا قبیح سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا اس لیے کچھ عالی ہمت، اہل علم نے روایت کی تحقیق کواپنا موضوع بنایا اور کسی رعایت اور لحاظ کے بغیر مشکوک ونامعتبر راویوں کے احوال سے لوگوں کو باخبر کرنے کی اہم ترین ذمہ داری اپنے سرلی، یہ فن "جرح وتعدیل" کہلاتا ہے؛ اسی دور میں اس فن کی بنیاد پڑی، اس فن کے سب سے بڑے امام یحیٰی بن سعید القطان (متوفی:۹۸) اسی عہد کے تھے؛ اسی طرح امام عبدالرحمٰن بن مہدی (متوفی:۱۹۸ھ)، یحیٰی بن معین (متوفی:۲۳۰ھ) اورامام احمد بن حنبل (متوفی:۲۴۱ھ) جواس فن کے اوّلین معماروں میں ہیں؛ اسی خوش نصیب عہد کی یادگار ہیں۔

(۳) مسائل فقہیہ کے استنباط اوراجتہاد میں قرآن مجید کی مختلف قرأتوں کا بھی بڑا دخل ہے؛ چنانچہ

اس عہد میں قرأت کے فن نے بھی بڑا عروج حاصل کیا اور قرأتِ سبع: نافع رحمہ اللہ (متوفی:۱۶۷ھ)، عبداللہ بن کثیر (متوفی:۱۲۰ھ)، ابوعمرو بن علاء (متوفی:۱۵۴ھ)، عبداللہ بن عامر (متوفی:۱۱۸ھ)، ابوبکر عاصم (متوفی:۱۲۸ھ) جن کے تلامذہ میں حفص بن سلیمان ہیں، حمزہ بن حبیب زیارت (متوفی:۱۵۶ھ) اورابوالحسن کسائی رحمہ اللہ (متوفی:۱۸۹ھ) اسی عہد کے قراء ہیں۔

قراء سبعہ پر جن تین قراء کا اضافہ کیا گیا ہے اوران کو قراءِ عشرہ کہا جاتا ہے، ان کا تعلق بھی اسی عہد سے ہے۔

(۴) اُصولِ فقہ کی باضابطہ تدوین بھی اسی عہد میں ہوئی، کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر امام ابوحنیفہ رحم اللہ علیہ کی کوئی تالیف " کتاب الرائی" کے نام سے تھی؛ لیکن اب اس کا کوئی وجود نہیں، امام محمد رحمہ اللہ کی طرف بھی اُصول کی ایک کتاب اسی نام سے منسوب کی جاتی ہے، یہ بھی دستیاب نہیں؛ لیکن ماضی قریب میں ابوالحسین بصری معتزلی کی کتاب "المعتمد فی اُصول الفقہ " طبع ہوئی ہے، اس کتاب میں امام ابویوسف رحمہ اللہ کی کتاب کا حوالہ موجود ہے؛ اس لیے حقیقت یہی ہے کہ اس فن کے موسس اوّل امام ابوحنیفہ اوران کے تلامذہ ہیں، اس وقت اس موضوع پر جو قدیم ترین کتاب پائی جاتی ہے، وہ امام شافعی رحمہ اللہ کی "الرسالہ" ہے۔ یہ نہایت اہم کتاب ہے اورابتدائی دور کی تالیف ہونے کے لحاظ سے نہایت جامع، واضح اور مدلل تالیف ہے، جس میں قرآن مجید کے بیان کے اُصول، سنت کی اہمیت اور قرآن سے اس کا ربط، ناسخ ومنسوخ، علل حدیث، خبرواحد کی حجیت، اجماع، قیاس، اجتہاد، استحسان اور فقہی اختلافِ رائے کی حیثیت پر گفتگو کی گئی ہے۔

(۵) اس دور میں فقہی اصطلاحات کا ظہور ہوا اوراحکام میں فرض، واجب، سنت، مباح اور مستحب جیسی اصطلاحات نے رواج پایا، تابعین کے عہد میں عام طور پر ایسی اصطلاحات قائم نہیں تھیں؛ بلکہ شریعت میں جن باتوں کا حکم دیا گیا، لوگ بلاتفریق اس پر عمل کرتے تھے اور جن باتوں سے منع کیا گیا، بلاکسی فرق کے ان سے اجتناب کرتے تھے۔

(٦) بمقابلہ پچھلے ادوار کے اس عہد میں اجتہاد واستنباط کی کثرت ہوئی، اس کے دو بنیادی اسباب تھے، ایک عباسی حکومت کا علمی ذوق، عباسیوں نے جہاں بغداد جیسا متمدن شہر آباد کیا اور عقلی علوم کو عربی زبان

کا جامہ پہنایا، وہیں اسلامی علوم سے بھی ان کو اعتناء تھا اور خود خلفاء علمی ذوق کے حامل ہوا کرتے تھے؛ بلکہ بعض دفعہ کسی رائے سے تاثر اور غلو کی وجہ سے نقصان بھی ہوتا تھا؛ چنانچہ بعض عباسی خلفاء کے معتزلہ سے متاثر ہونے کی وجہ سے "خلق قرآن کا فتنہ" پیدا ہوا جس کی خوں آشام داستانیں اب بھی تاریخ میں محفوظ ہیں، عباسی خلفاء کو فقہ سے بھی تعلق تھا؛ یہی وجہ ہے کہ منصور اور پھر خلیفہ ہارون رشید نے امام مالک رحمہ اللہ کی مؤطا کو ملکی دستور کی حیثیت دینی چاہی؛ لیکن یہ امام مالک رحمہ اللہ کا اخلاص تھا کہ انھوں نے اس سے منع فرمادیا، بعض عباسی خلفاء نے امام مالک رحمہ اللہ سے یہ شکایت بھی کی کہ ان کی کتاب میں حضرت عبداللہ بن عباس اور بنو ہاشم کے صحابہ کی مرویات کو وہ اہمیت نہیں دی گئی ہے، جو دوسرے صحابہ کی مرویات کو دی گئی ہے، امام مالک نے اس پر معذرت کی کہ مجھے حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہ کے تلامذہ سے استفادہ کا موقع نہیں ملا۔ یہ ان کے علمی ذوق ہی کی بات تھی کہ ہارون رشید قاضی ابو یوسف سے حکومت کے مالیاتی قوانین کے موضوع پر تالیف کا طلب گار ہوتا ہے اور اسی خواہش کے نتیجہ میں ان کی معروف مقبول تالیف "کتاب الخراج" وجود میں آتی ہے اور یہ بھی خلفاء کی علم پروری ہی ہے کہ ان کے عہد میں بغداد ہرفن کے علماء وماہرین کا مرکز وملجا بن جاتا ہے، اس حوصلہ افزائی اور علمی پذیرائی نے علماء کو اپنے اپنے فن کو پایہ کمال تک پہنچانے کا حوصلہ دیا۔

دوسرا سبب عالم اسلام کی وسعت تھی، اب مسلمانوں کی حکومت یورپ میں اسپین سے لے کر ایشیاء میں مشرق بعید چین تک تھی، مختلف قوموں، مختلف تہذیبیں، مختلف لسانی گروہ اور مختلف صلاحیتوں کے لوگ عالم اسلام کے سایہ میں تھے اور ان میں بڑی تعداد نو مسلموں کی تھی؛ اس لیے لوگوں کی طرف سے سوالات کی کثرت تھی اور اس نسبت سے فقہی اجتہادات کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا؛ اسی عہد میں بڑے بلند پایہ، عالی ہمت اور اپنی ذہانت وفطانت کے اعتبار سے محیر العقول علماء وفقہاء پیدا ہوئے؛ کیونکہ اس عہد میں اسی درجہ کے اہلِ علم کی ضرورت تھی؛ پھران میں سے بعض بلند پایہ فقہاء نے مستقل دبستانِ فقہ کی بنیاد رکھی اور ان سے علمی تاثر کی وجہ سے اہلِ علم کی ایک تعداد ان کے ساتھ ہوگئی اور اس نے ان کے علوم کی اشاعت وتدوین اور تائید وتقویت کے ذریعہ مستقل فقہی مدارس کو وجود بخشا، ان شخصیتوں میں سب سے ممتاز شخصیتیں ائمہ اربعہ کی ہیں۔

(۷) لیکن فقہ کی باضابطہ تدوین کا شرف سب سے پہلے جس شخصیت کو حاصل ہوا، وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ذات والاصفات ہے؛ اسی لیے امام شافعی نے فرمایا: "مَنْ اَرَادَ الفِقْـهَ فَهُوَ عَيَـالٌ عَلٰى اَبِىْ حَنِيْفَةَ"۔ (الانتقاء لابن عبدالبر: ۱۲۰)

جو شخص فقہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اوران کے اصحاب کو لازم پکڑے کیونکہ تمام لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے خوشہ چین (محتاج) ہیں۔" (مناقب الامام ابی حنیفہ ص 27)

اس کا اعتراف تمام ہی منصف مزاج علماء نے کیا ہے، حافظ جلال الدین سیوطی:

انـه اول مَـن دَوَّنَ عـلـم الشريعة وَرَتَّبَها ابوابا ثم تبعه مالك ابن انس فى ترتيب الموطا ولم يسبق ابا حنيفة احد(تبيض الصحيفه ٣٦)

ترجمہ: امام ابوحنیفہ پہلے شخص ہیں؛ جنھوں نے علم شریعت کی تدوین کی اوراسے باب وار مرتب کیا؛ پھر موطا کی ترتیب میں امام مالک نے انھیں کی پیروی کی، امام ابوحنیفہ سے پہلے کسی نے یہ کام نہیں کیا۔

علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ترجمہ: امام ابوحنیفہ پہلے شخص ہیں؛ جنھوں نے علم فقہ کو مدون کیا اور کتاب اور باب پر اس کو مرتب فرمایا، جیسا کہ آج موجود ہے اورامام مالک نے اپنی موطا میں انھیں کی اتباع کی ہے۔

پھر اہم بات یہ ہے کہ امام صاحب نے دوسرے فقہاء کی طرح انفرادی طور پر اپنی آراء مرتب نہیں کی؛ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح شورائی انداز اختیار کیا؛ چنانچہ علامہ موفق رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فَوضع ابو حنيفة مذهبه شورىٰ بينهم لم يستمد بنفسه دونهم۔

ترجمہ: امام ابوحنیفہ نے اپنا مذہب شورائی رکھا، وہ شرکاءِ شوریٰ کو چھوڑ کر تنہا اپنی رائے مسلط نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ بعض اوقات ایک مسئلہ پر ایک ماہ یا اس سے زیادہ بحث ومباحثہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا؛ (مناقب ابوحنیفہ: ۲/۳۳۱)

چنانچہ موفق رحمہ اللہ ہی رقم طراز ہیں:۔ كـان يـلـقـى مسـئـلـة مسئلة يقلبهم ويسمع ماعندهم ويقول ماعنده ويناظر هم شهرا او اكثر مِن ذالك حتى يستقر احدا لاقوال فيها (مناقب ابوحنیفہ: ۲/۳۳۱)

ترجمہ: امام صاحب ایک ایک مسئلہ پیش کرتے، ان کے خیالات کا جائزہ لیتے اوران کی بھی باتیں سنتے، اپنے خیالات پیش کرتے اور بعض اوقات ایک ماہ یااس سے زیادہ تبادلہ خیال کا سلسلہ جاری رکھتے؛ یہاں تک کہ کوئی ایک قول متعین ہوجاتا۔

اس مجلس تدوین میں جومسائل مرتب ہوئے اور جوزیرِ بحث آئے ان کی تعداد کیا تھی؟ اس سلسلہ میں تذکرہ نگاروں کے مختلف بیانات ملتے ہیں، مسانید امام ابوحنیفہ کے جامع علامہ خوارزمی نے تراسی ہزار (83000) کی تعداد لکھی ہے، جس میں اڑتیس ہزار کا تعلق عبادات سے تھا اور باقی کا معاملات سے۔ (مناقب الامام اعظم لملاعلی قاری:۴۷۳)

بعض حضرات نے ۶/ لاکھ اور بعضوں نے ۱۲/ لاکھ سے بھی زیادہ بتائی ہے، مشہور محقق مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ اس تعداد میں ان مسائل کو بھی شامل کرلیا گیا ہے، جوامام کے مقرر کئے ہوئے اُصول وکلیات کی روشنی میں مستنبط کئے گئے تھے۔ (دیکھئے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی سیاسی زندگی:۲۳۲۵) پس اگر تراسی ہزار مسائل ہی اس مجلس تدوین کے مستنبط کئے ہوئے مانے جائیں تو یہ کیا کم ہے؟

امام صاحب کی مجلس تدوین فقہ کے شرکاء کے نام

عام طور پر یہ بات نقل کی جاتی ہے کہ اس مجلس میں اپنے عہد کے چالیس ممتاز علماء شامل تھے؛ لیکن ان کے سنین وفات اورامام صاحب سے وابستگی کے زمانہ کو دیکھتے ہوئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ سارے لوگ شروع سے آخر تک اس کام میں شریک نہیں رہے؛ بلکہ مختلف ارکان نے مختلف ادوار میں کارِتدوین میں ہاتھ بٹایا اوران میں بعض وہ تھے جنھوں نے آخری زمانہ میں اس کام میں شرکت کی، عام طور پر شرکاءِ مجلس کا نام ایک جگہ نہیں ملتا ہے، مفتی عزیز الرحمٰن اور ڈاکٹر محمد میاں صدیقی نے ان ناموں کواکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے اور ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی نے ان ہی کے حوالہ سے اسے نقل کیا ہے، نام اس طرح ہیں:

امام ابویوسف (متوفی:182ھ)

محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ (متوفی:189ھ)

حسن بن زیاد (متوفی: 204ھ) زفر بن ہذیل (متوفی: 158ھ)

مالک بن مغول (متوفی: 159ھ) داؤد طائی رحمہ اللہ (متوفی: 160ھ)

مندل بن علی (متوفی: 168ھ) نصر بن عبدالکریم (متوفی: 169ھ)

عمرو بن میمون (متوفی: 171ھ) حبان بن علی (متوفی: 172ھ)

ابو عصمہ (متوفی: 173ھ) زہیر بن معاویہ (متوفی: 173ھ)

قاسم بن معن رحمہ اللہ (متوفی 175ھ) حماد بن ابی حنیفہ (متوفی: 176ھ)

ہیاج بن بطام (متوفی: 177ھ) شریک بن عبداللہ (متوفی: 178ھ)

عافیہ بن یزید (متوفی: 181ھ) عبداللہ بن مبارک (متوفی: 181ھ)

نوح بن دراج (متوفی: 182ھ) ہشیم بن بشیر سلمی (متوفی: 183ھ)

ابو سعید یحییٰ بن زکریا (متوفی: 184ھ) فضیل بن عیاض (متوفی: 187ھ)

اسد بن عمرو (متوفی: 188ھ) علی بن مسہر (متوفی: 189ھ)

یوسف بن خالد (متوفی: 189ھ) عبداللہ بن ادریس (متوفی: 192ھ)

فضل بن موسیٰ (متوفی: 192ھ) حفص بن غیاث (متوفی: 194ھ)

وکیع بن جراح (متوفی: 197ھ) یحییٰ بن سعید القطان (متوفی: 198ھ)

شعیب بن اسحاق (متوفی: 198ھ) ابو حفص بن عبدالرحمٰن (متوفی: 199ھ)

ابو مطیع بلخی (متوفی: 199ھ) خالد بن سلیمان (متوفی: 199ھ)

عبدالحمید (متوفی: 203ھ) ابو عاصم النبیل (متوفی: 212ھ)

مکی بن ابراہیم (متوفی: 215ھ) حماد بن دلیل (متوفی: 215ھ)

ہشام بن یوسف (متوفی: 197ھ)

(۸) اس دور میں فقہاء اپنی قوتِ اجتہاد اور لیاقتِ استنباط میں نہایت اعلیٰ درجہ کے حامل تھے، اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بات مقدر نہیں تھی کہ ان کے مذہب کو بقاء و استحکام حاصل ہوسکے؛ چنانچہ کم ہی عرصہ میں یہ

مذاہب ناپید ہوگئے؛ البتہ ان کی چیدہ چیدہ آراء، کتابوں اب بھی موجود ہیں، ان میں سے چار شخصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

امام اوزاعی رحمہ اللہ

ان کا پورا نام ابوعمر عبدالرحمٰن بن محمد ہے، یمن کے قبیلہ ذی الکاع کی ایک شاخ اوزاع تھی؛ اسی نسبت سے اوزاعی کہلائے، 88ھ میں شام میں پیدا ہوئے سنہ 157ھ میں وفات پائی، حدیث کے بڑے عالم تھے، اصحاب حدیث کے گروہ سے تعلق تھا اور قیاس سے اجتناب کرتے تھے، شام اور اندلس کے علاقہ میں ان کے مذہب کو قبولیت حاصل ہوئی؛ لیکن جلد ہی ان کے متبعین ناپید ہوگئے۔

(دیکھئے، تذکرالحفاظ للذھبی: ج۱ص۱۷۰)

سفیان ثوری رحمہ اللہ:

ابوعبداللہ سفیان بن سعید ثوری سنہ 97ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور سنہ 161ھ میں بصرہ میں وفات پائی، فقہ اور حدیث دونوں پر نظر تھی، عام طور پر ان کی آراء حدیث سے قریب ہوتی ہیں، ابتداء امام صاحب سے چشمک تھی؛ پھر بعد کو غلط فہمی دور ہوگئی اور امام ابوحنیفہ کے قدرداں ہوگئے۔

لیث بن سعد رحمہ اللہ:

یہ مصر میں پیدا ہوئے اور وہیں سنہ 175ھ میں وفات پائی، کہا جاتا ہے کہ تفقہ میں ان کا درجہ امام مالک اور شافعی سے کم نہیں تھا، خود امام شافعی ان کو امام مالک سے زیادہ فقیہ قرار دیتے تھے؛ لیکن ان کے مذہب کو زیادہ رواج حاصل نہیں ہوسکا اور جلد ہی ختم ہوگیا۔

داؤد ظاہری رحمہ اللہ:

ان کا پورا نام ابوسلیمان داؤد بن علی اصفہانی ہے سنہ 200ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور سنہ 270ھ میں وفات پائی، ابتدا میں فقہ شافعی کے متبع تھے، بعد میں پھر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی، ظاہر نص

پرعمل کرنے میں غلو تھا اور اسی غلو کی وجہ سے بعض آراء حد معقولیت سے گذر جاتی ہیں، داؤد ظاہری نے بہت سی کتابیں بھی تالیف کی ہیں، اس مکتب فکر کی نمائندہ شخصیت علامہ ابن حزم اندلسی (متوفی:456ھ) ہیں؛ جنھوں نے اپنی معروف کتاب "المحلیٰ" لکھ کر اصحاب ظواہر کی فکر کی آراء کو محفوظ کردیا ہے، ابن حزم ہی کی کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" بھی ہے، جس میں اصحاب ظواہر کے اُصولِ فقہ مدون ہیں، پانچویں صدی ہجری تک یہ مذہب پایا جاتا تھا (تاریخ التشریع الاسلامی لحضرمی:180) ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری تک بھی یہ مذہب باقی تھا؛ پھر اس کا نام ونشان مٹ گیا، موجودہ دور میں سلفیت کو اسی دبستانِ فقہ کا حیاء قرار دیا جاسکتا ہے۔

ابن جریر طبری رحمہ اللہ:

ابوجعفر محمد بن جریر طبری سنہ 224ھ میں طبرستان یں پیدا ہوئے سنہ 310ھ میں وفات پائی؛ انھوں نے فقہ حنفی، فقہ مالکی اور فقہ شافعی تینوں کو حاصل کیا؛ لیکن کسی کی تقلید نہیں کی اور خود اجتہاد کیا، تفسیر طبری اور تاریخ طبری ان کی معروف کتابیں ہیں، جو بعد کے اہلِ علم کے لیے اولین مرجع کا درجہ رکھتی ہیں؛ اسی طرح فقہی اختلافات پر "کتاب اختلافات الفقہاء" چھپ چکی ہے، ختم ہوجانے والے مذاہب میں اسی کو زیادہ دنوں تک زندگی حاصل رہی اور پانچویں صدی کے نصف تک بہت سے لوگ اس فقہ پر عمل تھے۔ (دیکھئے، تذکرۃ الحفاظ:۲/۲۵۱۔ کتاب الفہرست، لابن ندیم:۳۲۶۔ تاریخ التشریع الاسلامی:۱۸۳)

☆............☆............☆

پانچواں مرحلہ

فقہ سقوطِ بغداد تک (۶۵۶ھ)

فقہ کی تدوین وترتیب کا پانچواں مرحلہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل سے شروع ہوتا ہے اور 656ھ میں سقوطِ بغداد پر ختم ہوتا ہے، جب چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے عالمِ اسلامی کے دار الخلافہ بغداد پر غلبہ حاصل کیا، آخری عباسی خلیفہ کو نہایت بے دردی سے قتل کر دیا اور ایسی خوں آشامی اور ہلاکت خیزی کا ثبوت دیا کہ انسانیت سوزی اور قتل وغارت گری کی تاریخ میں کم ہی اس کی مثال مل سکے گی۔

اس عہد کی خصوصیات اس طرح ہیں:

(ا) اسی عہد میں شخصی تقلید کا رواج ہوا اور لوگ تمام احکام میں ایک متعین مجتہد کی پیروی کرنے لگے، تقلید کی اس صورت کو مختلف اسباب کی وجہ سے تقویت پہنچی، جن کا تذکرہ مناسب محسوس ہوتا ہے:

(الف) بہت سے ایسے لوگ دعوی اجتہاد کرنے لگے جو حقیقت میں اس منصب کے اہل نہیں تھے اور وہ اجتہاد کو قرآن وحدیث سے انحراف کا چور دروازہ بنانے لگے، اس لیے دین کے تحفظ اور دفع فساد کے لیے اس زمانہ کے بالغ نظر اور محتاط علماء نے ضروری سمجھا کہ موجودہ حالات میں باب اجتہاد کو بند کر دیا جائے اور اُمت کو ان آوارہ خیالوں کے فتنہ سے بچایا جائے۔

(ب) ائمہ مجتہدین کی سعی ومحنت سے فقہ اسلامی کی ترتیب وتدوین پایہ کمال کو پہنچ چکی تھی اور ان کی مساعی کی وجہ سے لوگوں کے لیے ہر طرح کے مسائل کا حل موجود تھا؛ اس لیے گذشتہ ادوار میں جس درجہ اجتہاد و استنباط کی ضرورت تھی اب اتنی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کا قدرتی نظام ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے تو اس طرف لوگوں کی توجہ بھی کم ہو جاتی ہے۔

(ج) بعض مجتہدین کو من جانب اللہ لائق تلامذہ اور لائق ماہرین ومتبعین ہاتھ آئے اور انھوں نے اس مجتہد کی آراء وافکار کو نہایت بہتر طور پر مرتب کر دیا، اس کی وجہ سے لوگوں میں ان کے اجتہادات کے تئیں قبولِ عام کا رجحان پیدا ہو گیا اور اس طرح ایک مستقل دبستانِ فقہ کی تشکیل عمل میں آ گئی، جن فقہاء کو ایسے لائق

شاگرد میسر نہیں آئے، ان کی فقہ باضابطہ طور پر مدون نہیں ہو پائی اور آہستہ آہستہ علمی زندگی سے اس کا رشتہ کٹ گیا، اس کی واضح مثال امام اوزاعی اور لیث بن سعد ہیں، جن کو ان کے معاصرین تفقہ کے اعتبار سے بعض ائمہ متبوعین سے بھی فائق قرار دیتے تھے؛ لیکن آج کتابوں میں چند مسائل سے متعلق ان کی آراء مل جاتی ہیں اور بس۔

(د) صحابہ اور تابعین کے عہد میں کسی کو قاضی بنایا جاتا تو اسے ہدایت دی جاتی کہ وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کو اصل بنائے اور اگر کتاب وسنت میں حکم نہ ملے تو اجتہاد سے کام لے، اس سلسلہ میں وہ خط جو حضرت عمر رضی اللہ عنہنے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا حدیث وفقہ اور قضاء سے متعلق اکثر کتابوں میں نقل کیا گیا ہے، بعد کے ادوار میں یوں ہوا کہ بعض قضاء حق اجتہاد کو ظلم وزیادتی اور کسی فریق کے حق میں طرف داری کا ذریعہ بنانے لگے، اس پس منظر میں حکومتیں جب کسی کو قاضی مقرر کرتیں تو ان کو پابند کر دیتیں کہ فلاں مذہب کے مطابق فیصلہ کیا کریں؛ تاکہ فیصلوں میں یکسانیت رہے اور جانب داری کی گنجائش باقی نہ رہے؛ چنانچہ عباسی خلفاء عام طور پر فقہ حنفی پر قاضی مقرر کیا کرتے؛ اسی طرح ترکوں نے بھی عہدہ قضاء کو احناف کے لیے مخصوص رکھا، صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے مصر میں اور سلطان محمود سبکتگین رحمہ اللہ اور نظام الملک طوسی نے مشرقی علاقہ کی عدالتوں کو فقہ شافعی کے مطابق فیصلے کرنے کا حکم دیا، یہ بھی تقلیدِ شخصی کی ترویج کا ایک اہم سبب بنا۔

(ہ) تقلید پر انحصار کا ایک سبب علمی انحطاط بھی تھا، اللہ تعالیٰ کا نظام یہ ہے کہ ہر عہد میں اس عہد کی ضرورت کے مطابق افراد پیدا ہوتے ہیں اور ضرورت جوں جوں کم ہوتی جاتی ہے؛ اس طرح کے افراد بھی کم ہوتے جاتے ہیں؛ یہی دیکھیئے کہ روایتِ حدیث کے دور میں کیسے قوی الحفظ محدثین پائے جاتے تھے؛ جنھیں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں حدیثیں یاد ہوتی تھیں اور سند ومتن صفحہ ذہن پر اس طرح نقش ہوجاتا تھا کہ گویا وہ پتھر پر کندہ کر دیئے گئے ہیں؛ لیکن تدوین حدیث کا کام مکمل ہونے کے بعد پھر اس صلاحیت کے لوگ پیدا نہیں ہوسکے، زمانہ جاہلیت میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا، تو لوگوں کو شاعروں کی پوری پوری دیوان نوکِ زبان ہوتی تھیں اور اس طرح جاہلیت کا ادب محفوظ ہوسکا، بعد کے ادوار میں ایسی مثالیں شاذ ونادر ہی مل سکیں؛ اسی

طرح جب تک شریعتِ اسلامی کے ایک مکمل نظامِ حیات کی ترتیب وتدوین اور زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق مسائل کے حل کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کو پوری کرنے کے لیے مجتہدانہ بصیرت مطلوب تھی، اجتہادی صلاحیتوں کے لوگ پیدا ہوتے رہے، جب اس کی ضرورت کم ہوگئی تو اس نسبت سے ایسے افراد کی پیدائش بھی کم ہوگئی۔

(۲) تقلید کے رواج نے جو ایک منفی اثر پیدا کیا وہ فقہی تعصب وتنگ نظری اور جدل ومناظرہ کی کیفیت کا پیدا ہوجانا ہے؛ گذشتہ ادوار میں بھی فقہی مسائل میں اختلافِ رائے پایا جاتا تھا؛ لیکن ایک دوسرے سے تعصب کی کیفیت نہیں تھی اور نہ اس کے لیے معرکہ جدل برپا ہوتا تھا، اس دور میں بدترین قسم کی تنگ نظری وجود میں آئی، لوگ اپنے امام کی تعریف میں مبالغہ کی آخری حدود کو بھی پار کرجاتے تھے اور مخالف نقطہ نظر کے حامل امام ذی احترام کی شان میں گستاخی اور بدکلامی سے بھی باز نہیں رہتے تھے؛ یہاں تک کہ ان مذموم مقاصد کے لیے بعض خدا ناترس لوگوں نے روایتیں بھی گھڑنی شروع کردیں۔ چونکہ عوام میں فقہ حنفی اور فقہ شافعی کو زیادہ رسوخ حاصل تھا؛ اس لیے معرکے بھی انھیں دونوں مکاتب فکر کے درمیان نسبتاً گرم ہوتے تھے اور اپنے مسلک کی ترویج کے لیے بعض اوقات بہت ہی پست حرکات کی جاتی تھیں، سلطان محمود سبکتگین اصل میں حنفی تھا اور کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا، ایک شافعی عالم نے اس کو متاثر کرنے کے لیے اس کے سامنے بے ترتیبی کے ساتھ جیسے تیسے وضو کیا، پھر جلدی جلدی نماز پڑھی اور سلام پھیرنے سے پہلے قصداً وضو توڑنے کا ارتکاب کیا اور بادشاہ سے کہا کہ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی نماز ہے؛ پھر اچھی طرح وضو کیا اور بہتر طریقہ پر نماز ادا کی اور بادشاہ سے کہا کہ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کی نماز ہے؛ چنانچہ سلطان محمود نے اس واقعہ سے متاثر ہوکر شافعیت کو اختیار کرلیا اور نقل کرنے والوں کے بہ قول اس حرکت کا ارتکاب کرنے والا کوئی عامی نہیں تھا؛ بلکہ یہ ایک ممتاز شخصیت قفال شاشی تھا۔ (تاریخ الفقہ الاسلامی، محمد علی سائس: ۲۳۱)

احکامِ نماز میں جو اختلافِ رائے مثلاً احناف اور شوافع کے درمیان پایا جاتا ہے، یہ صحابہ کے درمیان بھی تھا اور تابعین وائمہ مجتہدین کے زمانہ میں بھی تھا؛ لیکن وہ بے تکلف ایک دوسرے کے پیچھے نماز ادا کرتے رہے ہیں اور یہ بات ان کے ہاں کوئی معیوب چیز نہیں تھی۔

سلفِ صالحین کے زمانہ میں مناظرہ ایک طرح کا تبادلہ خیال ہوتا تھا، جس میں ایک دوسرے کا پورا احترام ملحوظ رکھا جاتا اور جو بات صحیح نظر آتی تھی اسے لوگ قبول کرتے تھے؛ لیکن اس دور میں مناظرہ کے نام پر مجادلہ اور باہمی سب وشتم کا سلسلہ شروع ہوا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہوں اور رئیسوں کے دربار اور بڑی بڑی مسجدیں مناظرہ کا اکھاڑہ بن گئی تھیں اور بہت سے جاہل فرماں روا، جیسے مرغوں اور جانوروں کا مقابلہ کراتے اور تماشہ دیکھتے تھے؛ اسی طرح علماء سے مناظرہ کرا کر ان سے لطف لیا جاتا تھا؛ اسی لیے اس عہد کے بہت سے حنفی اور شافعی علماء کے حالات میں خاص طور سے اس کا ذکر ملے گا کہ یہ مذہب مخالف کے فلاں عالم سے مناظرہ کرتے تھے اور یہ کہ مناظرہ میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔

(۳) اس عہد میں مقلد علماء نے دو اہم کام کئے، ایک تو اپنے دبستانِ فقہ کی آراء کے لیے دلائل کی تلاش اور استنباط؛ کیونکہ اصحاب مذہب سے بہت سے مسائل میں صرف ان کی رائے ملتی تھی اور اس رائے پر دلیل منقول نہیں تھی؛ لہٰذا کچھ تو علمی اور تحقیقی ضرورت اور کچھ مناظروں کی گرم بازاری اور فریق مخالف کی جواب دہی کے پس منظر میں نصوص اور عقل وقیاس سے مذہب کی آراء پر دلیل فراہم کی گئیں؛ دوسرا کام ایک ہی مذہب فقہی کی حدود میں مختلف آراء کے درمیان ترجیح کا ہوا، یہ ترجیح کی ضرورت دو موقعوں پر پیش آتی ہے، ایک اس وقت جب امام سے مختلف راویوں نے الگ الگ رائے نقل کی ہو، اس صورت میں راوی کے استناد و اعتبار کے لحاظ سے ترجیح دی جاتی ہے کہ کونسی نقل زیادہ دُرست ہے؟ اسی بناء پر حنفیہ کے یہاں ظاہر روایت کو نوادر پر، مالکیہ کے ہاں ابن قاسم کی روایت کو ابن وھب، ابن ماجشون اور اسد ابن فرات کی روایت پر اور شوافع کے یہاں ربیع ابن سلیمان کی روایت کو مزنی کی روایت پر مقدم رکھا جاتا ہے، دوسرے اُس وقت جب امام سے ایک سے زیادہ اقوال صحیح ومستند طریقہ پر ثابت ہوں؛ ایسی صورت میں امام کے اصول استنباط اور کتاب وسنت اور قیاس سے موافقت اور ہم آہنگی کی بنیاد پر بعض اقوال کو ترجیح دی جاتی ہے؛ اس لیے ان میں اختلاف رائے کا پیدا ہونا فطری ہے؛ اسی لیے ایک ہی مذہب کے مختلف مصنفین کے نزدیک اقوال وآراء کی ترجیح میں خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

اس دور کا ایک قابل ذکر کام ائمہ مجتہدین کے اقوال کی تشریح وتوضیح بھی ہے، یعنی مجمل احکام کی

توضیح، بعض مطلق اقوال سے متعلق شرائط و قیود کا بیان اور آراء کی تنقیح ۔اس طرح اس عہد میں ائمہ متبوعین کے مذاہب کی تنظیم وتدوین اور توضیح وتائید کا بڑا اہم کام انجام پایا ہے۔

(۴)اس دور کا تذکرہ نامکمل ہوگا؛ اگر اس دور کے اہم فقہاء اور اہلِ علم کا ذکر نہ کیا جائے؛ اس لیے اختصار کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

حنفیہ:

امام ابوالحسن عبداللہ بن حسن کرخی (340-260ھ)

ابوبکر جصاص رازی (م370ھ)

ابوجعفر محمد بن عبداللہ بلخی ھندوانی (م362ھ)

ابواللیث نصر بن محمد سمرقندی، امام الھدیٰ (م373ھ)

ابوعبداللہ یوسف بن محمد جرجانی (م398ھ)

ابوالحسن احمد قدوری (م427ھ)

ابوزید عبداللہ دبوسی، سمرقندی (م۴۰۰ھ)

ابوعبداللہ حسین صیمری (م436ھ)

ابوبکر خواہرزادہ بخاری (م433ھ)

شمس الائمہ عبدالعزیز حلوانی (م418ھ)

شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی صاحب المبسوط (م483ھ)

ابوعبداللہ محمد بن علی دامغانی (478-400ھ)

علی بن محمد بزدوی (م483ھ)

شمس الائمہ بکر بن محمد زرنجری (512-427ھ)

ابواسحاق ابراہیم بن اسماعیل صفار (574ھ)

طاہر بن احمد بخاری (م 542ھ)

ظہیر الدین عبد الرشید والوالجی (م 540ھ)

ملک العلماء ابوبکر ابن مسعود کاسانی (م 587ھ)

فخر الدین حسن اوزجندی قاضی خان (م 592ھ)

علی ابن ابی بکر مرغینانی صاحب ہدایہ (م 593ھ)

بکر بن علا قشیری (م 314ھ)

ابوبکر بن عبداللہ المعیطی (م 367ھ)

یوسف بن عمر بن عبد البر (م 380ھ)

ابومحمد عبداللہ بن اُبی زید قیروانی (م 386ھ)

ابوبکر محمد بن عبداللہ بھری (م 395ھ)

قاضی عبد الوھاب بغدادی (م 422ھ)

ابوالقاسم عبد الرحمٰن حضرمی (م 440ھ)

ابوالولید سلیمان باجی (م 494ھ)

ابوالحسن علی لخمی (م 498ھ)

ابوالولید محمد بن رشد قرطبی (م 525ھ)

ابوعبداللہ محمد تمیمی (م 526ھ)

ابوبکر محمد بن عربی صاحب احکام القرآن (م 536ھ)

ابوالفضل قاضی عیاضی (م 541ھ)

محمد بن احمد بن محمد بن ارشد 'دبیز متن' صاحب ہدای المجتہد (م 595ھ)

یہ اُوپر ذکر کیئے گئے ابنِ رشد 'دبیز متن' صاحب کتاب المقدمات کے پوتے ہیں، اس لیے "ابن رشد الحفید" کہلاتے ہیں۔

عبداللہ بن نجم سعدی (م610ھ)

شوافع:

ابواسحاق ابراہیم مروزی (م240ھ)

ابوعلی حسین، المعروف بابن ابی ہریرہ (م345ھ)

قاضی ابوحامد مروزی (362ھ)

محمد بن اسماعیل قفال کبیر شاشی (م365ھ)

ابوالقاسم عبدالعزیز دارکی (375ھ)　　ابوالقاسم عبدالواحد یعمری (386ھ)

ابوعلی حسین سنجی (403ھ)　　ابوحامد ابن محمد اسفرائنی (م408ھ)

عبداللہ ابن احمد قفال صغیر (م417ھ)　　ابواسحاق ابراہیم اسفرائنی (م418ھ)

ابوالطیب طاہر طبری (م450ھ)　　ابوالحسن علی ماوردی (350ھ)

ابوعاصم محمد مروزی (م458ھ)　　ابواسحاق ابراہیم شیرازی (م476ھ)

ابونصر محمد بن صباغ (م477ھ) امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک جوینی (م487ھ)

حجۃ الاسلام ابوحامد محمد غزالی (450-505ھ)

ابوالقاسم عبدالکریم رافعی (م623ھ)　　محی الدین ابوزکریا نووی (م631ھ)

☆............☆............☆

چھٹا مرحلہ

سقوطِ بغداد تا اختتام تیرھوی صدی

یہ عہد بھی بنیادی طور پر پہلے ہی عہد کے مماثل ہے، جس میں مختلف مسالک کے اہل علم نے اپنے مذہب فقہی کی خدمت کی، مختلف مذاہب سے متعلق متون اور متون پر مبنی شروح وحدیث کی ترتیب عمل میں آئی، فتاویٰ مرتب ہوئے، فتاویٰ سے مراد دوطرح کی تحریریں ہیں، ایک متاخرین کے اجتہادات، دوسرے مستفتیوں کے سوالات کے جوابات اسی طرح علمی اعتبار سے اس دور کی خصوصیات کو تین نکتوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

1۔اوّل: یہ کہ گذشتہ ادوار میں علماء کے درمیان باہمی ارتباط (میل ملاپ) اورافادہ واستفادہ کا دائرہ بہت وسیع تھا، خاص کر حج کا موسم ایک ایسی بڑی درسگاہ کی شکل اختیار کر لیتا تھا، جس میں پوری دنیا کے اہلِ علم ایک دوسرے سے کسب فیض کرتے تھے اور ان کی آراء اور علوم سے فائدہ اُٹھاتے تھے؛ لیکن مذہبی تصلب (سختی وشدت) اور مسلمان آبادیوں کی مختلف مملکتوں میں تقسیم وغیرہ کی وجہ سے اب افادہ واستفادہ کا یہ عالمی مزاج محدود ہوگیا اور ایک ملک اور ایک علاقہ کے علماء ایک دوسرے سے استفادہ پر اکتفاء کرنے لگے۔

2۔دوسرے: متقدمین کی کتابوں میں طرزِ گفتگو مجتہدانہ ہوا کرتا ہے، امت آخرین کے یہاں زیادہ سے زیادہ جزئیات کو جمع کرنے کا اہتمام پیدا ہوا، اس دور میں متقدمین کی کتابوں سے اہلِ علم کا رشتہ کمزور ہوگیا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جزئیات کی کثرت سے آدمی مسائل کا حافظ ہوسکتا ہے؛ لیکن اس میں تفقہ کی شان پیدا نہیں ہوسکتی۔

3۔تیسرے: متقدمین کے یہاں طریقہ تالیف سادہ، سلیس اور واضح ہوا کرتا تھا، عبارت سہل ہوا کرتی تھی اور اصل توجہ فن اور مضمون پر ہوتی تھی؛ لیکن متاخرین کے یہاں الفاظ کی کفایت اور مختصر نویسی کمال ٹھہرا؛ یہاں تک کہ عبارتیں چیستاں (پہیلی، معمّا) بن گئیں؛ پھر کئی کئی مصنفین نے اس کی عقدہ کشائی میں اپنا زورِ قلم صرف کیا، حاشیے، شرحیں؛ پھر ان شرحوں پر حواشی اور کبھی ان شروح پر شروح، نتیجہ یہ ہوا کہ فن سے توجہ ہٹ گئی اور غیر متعلق اُمور پر محنتیں صرف ہونے لگیں، اس اختصار نویسی کا نمونہ علامہ نسفی کی" کنز الدقائق"

زکریا انصاری کی "منہج الطلاب" اور مالکیہ میں "مختصر خلیل" میں دیکھی جاسکتی ہے، خاص کر مالکیہ کے یہاں مسائل کی تعبیر میں اور بھی زیادہ اغلاق (ابہام، پیچیدگی) پایا جاتا ہے۔

اِس صورتِ حال نے فقہی ارتقاء (ترقی) کے راستے روک دیئے اور زیادہ تر متون کی مختصرات اور پھران مختصرات پر شروح وحواشی کا کام ہوتا رہا؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت سی گراں قدر تالیفات بھی اسی عہد کی یادگار ہیں؛ خاص کر دسویں صدی ہجری کے اوائل تک متعدد صاحب نظر اہل علم پیدا ہوئے، جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

حنفیہ:

ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی (م 710ھ)

ابومحمد عثمان فخرالدین زیلعی (م 743ھ)

محمد بن عبدالواحد کمال الدین ابن ہمام (م 761ھ)

محمد بن احمد بدرالدین عینی (م 762۔855ھ)

زین العابدین ابن نجیم مصری (م 969ھ)

شمس الدین محمد بن امیر الحاج حلبی (م 879ھ)

حافظ سیف الدین قطلو بغا (م 798۔881ھ)

عمر بن ابراہیم ابن نجیم، صاحب النہر الفائق (م 1005ھ)

مالکیہ:

ابوضیاء خلیل کردی (م 776ھ) ابوالحسن نورالدین اجھوری (م 967۔1066ھ)

محمد بن عبداللہ قریشی (م ھ) نورالدین عدوی (م ھ)

شوافع:

علامہ تقی الدین سبکی (م683۔752ھ)

شیخ الاسلام زکریا انصاری (م826۔926ھ)

شہاب الدین ابن حجر ہیثمی (م909۔995ھ)

حنابلہ:

علامہ تقی الدین احمد بن تیمیہ (م661۔728ھ)

شمس الدین ابن قیم جوزی (م691۔751ھ)

☆............☆............☆

ساتواں مرحلہ

فقہ اسلامی عہدِ جدید میں

فقہ اسلامی کے ارتقاء (ترقی) کے سلسلہ میں جدید دور کا نقطہ آغاز تیرہویں صدی ہجری کے اواخر کو قرار دیا جاسکتا ہے، جب خلافتِ عثمانیہ کے حکم پر "مجلۃ الاحکام العدلیہ'' کی ترتیب عمل میں آئی، اس عہد میں فقہ اسلامی کی خدمت کا ایک رجحان پیدا ہوا ہے اور اس سلسلہ میں جو کاوشیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) مسلکی تعصب جو خلافتِ عباسیہ کے سقوط کے بعد سے بہت شدت اختیار کر گیا تھا اور فقہی مسائل مناظرہ ومجادلہ کا موضوع بن چکے تھے، الحمد للہ اب اس صورتِ حال میں بہتری آئی ہے، اب اہلِ علم مختلف ائمہ اور مجتہدین کی آراء کو پورے احترام اور انصاف کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، عوامی مجلسوں میں تمام ہی سلفِ صالحین کے موعظت آمیز واقعات نقل کئے جاتے ہیں، کتابوں میں مخالف دلائل کا بھی انصاف کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، حرمین شریفین میں چار علیحدہ مصلیٰ کی صورت ختم ہوجانے کے بعد سے ایک دوسرے کے پیچھے نماز ادا کرنے کا مزاج عام ہوا ہے، ان موضوعات پر مناظروں کی گرم بازاری ختم ہوئی ہے اور نئے مسائل پر غور کرنے کے لیے مختلف مسالک کے علماء ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اور پورے جذبہ مسامحت کے ساتھ تمام نقاطِ نظر کو سنتے ہیں، یہ بہت ہی مثبت تبدیلی ہے، جو خاص کر گذشتہ نصف صدی میں اُبھر کر سامنے آئی ہے۔

(۲) دوسرا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جہاں احناف وشوافع اور شوافع ومالکیہ کی بے معنی آتش جنگ بجھ چکی ہے، وہیں اس دور میں "ظاہریت" اپنے اسی مزاج ومذاق کے ساتھ جو ابن حزم وغیرہ کی تحریروں سے ظاہر ہے، نئے لباس اور نئے پیکر میں ظہور پذیر ہوئی ہے، یہ حضرات اپنے آپ کو اہلِ حدیث، سلفی، محمدی، اثری، مسلمین وغیرہ مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں؛ انھوں نے نماز سے متعلق چار، پانچ مسائل، طلاق سے متعلق ایک مسئلہ اور طریقہ مصافحہ کو اپنی تمام علمی کاوشوں اور محنتوں کا محور بنا رکھا ہے اور اپنے گمان میں اسے تبلیغ دین تصور کرتے ہیں؛ اس فرقہ نے اُمت کے سوادِ اعظم (وہ جماعت جس میں علمائے حق کی تعداد زیادہ

ہو)اور سلفِ صالحین پر طعن و تشنیع اور فروعی مسائل پر مناظرہ ومجادلہ؛ نیز دوسرے مسلمانوں کی تکفیر کا اس سے زیادہ بدترین طریقہ اختیار کر رکھا ہے، جو کسی زمانہ میں تنگ نظر مقلد عوام ایک دوسرے کے خلاف کیا کرتے تھے، فھداھم اللہ ووفقھم بالحق۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ برصغیر میں یہ غلو پسند فرقہ اپنی نسبت شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور عرب علماء سے کرتا ہے؛ حالانکہ شیخ نجدی نے خود اپنے آپ کو حنبلی قرار دیا ہے اور عام عرب علماء و محققین ایسی تنگ نظری اور تعصب میں مبتلا نہیں ہیں جو اس فرقہ کا امتیاز ہے، خود ہندوستان میں اس مکتبِ فکر کے بزرگوں نواب صدیق حسن خان، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبداللہ غزنوی وغیرہ کے یہاں اس طرح کا غلو نہیں ملتا، برصغیر میں غیر مقلدین کی جو نئی نسل نشو ونما پارہی ہے افسوس کہ ان کی اکثریت اس وقت اُمت میں تفریق و انتشار کی نقیب و ترجمان بنی ہوئی ہے۔

(۳) سترھویں صدی کے انقلاب کے بعد سے جدید مسائل کی ایجاد، عالمی تعلقات میں قربت اور مختلف ممالک کے درمیان باہمی ارتباط (میل ملاپ) میں اضافہ، تہذیبی اقدار میں تبدیلی اور سیاسی و معاشی نظام میں آنے والے تغیرات کے پسِ منظر میں جس تیزی سے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، بحمد للہ علماء اور ارباب افتاء کی توجہ ان مسائل کے حل کی طرف مبذول ہوئی ہے، اس سے دوہرا فائدہ ہوا، ایک تو شریعت اسلامی کو اس وقت جس خدمت کی ضرورت ہے، اہلِ علم کی صلاحیتیں اس خدمت میں صرف ہو رہی ہے، دوسرے گذشتہ دو تین صدیوں سے کسی نئے علمی کام کے بجائے تفصیل کا اختصار اور اختصار کی تفصیل؛ نیز غیر اہم مسائل کی تحقیق اور فریق مخالف کے نقطہ نظر کو کمزور ثابت کرنے پر جو کاوشیں ہو رہی تھیں، صحیح میدانِ عمل مہیا ہونے کی وجہ سے اب اس رویہ کی اصلاح ہوئی ہے۔

(۴) اس دور میں جو علمی کارنامے انجام پائے ہیں یا پارہے ہیں، ان کو ہم چار حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

1۔اوّل فقہی مضامین کو دفعہ وار جدید قانونی کتابوں کے انداز پر مرتب کرنا کہ اس سے لوگوں کے لیے استفادہ آسان ہو جاتا ہے اور عدالتوں کے لیے یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ وہ اس قانون کو اپنے لیے نشانِ

راہ بنائے، اس کی ابتداء "مجلۃ الاحکام" سے ہوئی حکومتِ عثمانیہ ترکی نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے، وزیر انصاف کی صدارت میں اکابر فقہاء کی ایک کمیٹی تشکیل دی اور انھیں حکم دیا کہ فقہ حنفی کے مطابق نکاح، تجارت اور تمام معاملات کے احکام کو دفعہ وار مرتبہ کریں، 1285ھ مطابق 1869ء میں یہ کام شروع ہوا اور سات سال کی محنت کے بعد 1293ھ مطابق 1876ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا؛ پھر شعبان 1293ھ کو حکومت کے حکم سے اس کی تنفیذ عمل میں آئی، اس مجموعہ کے شروع میں فقہ، اس کی اقسام اور ننانوے قواعد پر مشتمل مقدمہ ہے، یہ مجموعہ سولہ مرکزی عنوانات اور اس کے تحت مختلف ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب کے شروع میں اس باب سے متعلق فقہی اصطلاحات نقل کی گئی ہیں، کل دفعات (1851) ہیں، یہ مجموعہ فقہ حنفی کے راجح اقوال پر مبنی ہے؛ البتہ بعض مسائل میں احوالِ زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے ضعیف اقوال کو بھی قبول کیا گیا ہے۔

اس کے بعد مختلف مسلم ممالک میں حکومت کی زیرنگرانی احوالِ شخصیہ سے متعلق مجموعہ قوانین کی ترتیب عمل میں آئی، یہ مجموعے کسی ایک فقہ پر مبنی نہیں تھے؛ بلکہ ان میں مختلف مذاہب سے استفادہ کیا گیا تھا؛ لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ مختلف ممالک میں یورپ کے اثر سے قانونِ شریعت میں ناقابلِ قبول تبدیلیاں کردی گئی ہیں، جیسے تعدادِ ازدواج کا مسئلہ، احکامِ طلاق، میراث میں مرد وعورت کے درمیان فرق، وغیرہ؛ اسی طرح مجموعہ قوانین کی ترتیب کی بہت ہی قابل قدر انفرادی کوششیں بھی عمل میں آئی ہیں، اس سلسلہ میں فقیہ محمد قدری پاشاہ کی "مرشد الحیر ان لمعرفۃ احوال الانسان" فقہ حنفی کے مطابق احوالِ شخصیہ، وقف اور معاملات سے متعلق احکام پر مشتمل ہے اور جس کی دفعات (1045) ہیں، شیخ ابوزہرہ کی "الاحوال الشخصی (جس میں کسی ایک مذہب کی پابندی نہیں کی گئی) اور شیخ احمد بن عبداللہ قاری کی "مجلۃ الاحکام الشرعی علی مذہب الامام احمد بن حنبل شیبانی" (جو مجلۃ الاحکام کے طرز پر فقہ حنبلی کے نقطہ نظر سے معاملات کے احکامات کا مجموعہ ہے، 2384 دفعات پر مشتمل ہے) نیز جرم وسزا کے اسلامی قانون سے متعلق ڈاکٹر عبدالقادر عودہ شہید کی "التشریع الجنائی الاسلامی" (۲/ حصے، 984 دفعات) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، عالم عرب میں اس طرح کی اور بھی بہت سی کوششیں ہوئی ہیں، جس نے عام لوگوں کے لیے استفادہ کو آسان کردیا ہے۔

برصغیر میں اس سلسلہ میں جو کوشش ہوئی ہیں ان میں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب کی مجموعہ قوانین

اسلام اور ہندوستان میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے زیر نگرانی پرسنل لاء سے متعلق مجموعہ قوانین (جو غالباً ٦/ جلدوں پر مشتمل ہے) نہایت اہم ہے، یہ دونوں مجموعے بنیادی طور پر فقہ حنفی کے لحاظ سے مرتب کئے گئے ہیں؛ البتہ بعض مسائل میں دوسرے دبستانِ فقہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے؛ اسی سلسلہ کی ایک اہم کوشش اسلام کے عدالتی قوانین سے متعلق حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی اسلامی عدالت ہے جو 740/ دفعات پر مشتمل ہے اور اُردو زبان میں اس موضوع پر منفرد کتاب ہے، اس کا عربی ترجمہ بھی بیروت سے شائع ہو چکا ہے۔

(۵) اس دور میں قدیم کتابوں کی خدمت میں بھی بعض نئے پہلو اختیار کئے گئے ہیں، جیسے مضامین کی فقہ بندی، تفصیلی فہرست سازی، تعلیق وتحقیق اور ایک اہم سلسلہ حروفِ تہجی کی ترتیب پر مضامین فہرست سازی کا بھی شروع ہوا ہے، جو کتاب سے مراجعت کرنے والوں کے لیے بہت ہی سہولت بخش ہے، چنانچہ احمد مہدی نے "ردالمحتار" کی، محمد اشقر نے "المغنی لابن قدامه" کی اور محمد منتصر کتانی نے "المحلی لابن حزم" کی ابجدی فہرست بنائی ہے؛ اسی طرح فقہ مالکی میں "الشرح الصغیر للدردیر" ابجدی فہرست کے ضمیمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے، ان فہارس نے طویل کتابوں سے استفادہ اور مطلوبہ مضامین کے حصول کو آسان کر دیا ہے، خاص کر جن کتابوں کو کمپیوٹر میں فہارس کے ساتھ محفوظ کر دیا گیا ہے، ان سے استفادہ مزید سہل ہو گیا ہے۔

موجودہ دور میں مختلف علوم کی انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا رجحان عالمی سطح پر اور ہر زبان میں بڑھ رہا ہے، بحمد للہ فقہ اسلامی میں بھی اس سلسلہ میں متعدد کوششیں کی گئی ہیں؛ چنانچہ جب مشہور اسلامی مؤلف اور داعی ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی دمشق یونیورسٹی میں "کلیۃ الشریعۃ" کے صدر شعبہ بنے تو فقہ اسلامی کی "دائرۃ المعارف" کی ترتیب کا منصوبہ پیش کیا اور 1956 میں حکومتِ شام نے اسے منظور کر لیا، اس مقصد کے لیے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، ڈاکٹر احمد سمان، ڈاکٹر مصطفیٰ زرقاء ڈاکٹر معروف دوالیبی اور ڈاکٹر یوسف العش جیسے ممتاز اصحاب تحقیق پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی گئی اور کام چار مراحل پر تقسیم کیا گیا، جن میں پہلا مرحلہ موسوعہ میں آنے والے فقہی موضوعات کی تعیین وترتیب تھی، افسوس کہ طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود اس کا پہلا مرحلہ ہی تشنہ تکمیل ہے۔

1958ء میں جب مصر وشام کا اتحاد ہوا تو مشترکہ طور پر مصر اور شام نے مل کر اس موسوعہ کی ترتیب کا ذمہ لیا؛ لیکن یہ اتحاد جلد ہی 1961ء میں ٹوٹ گیا؛ چنانچہ 1962ء میں حکومتِ مصر نے از سرِ نو اس کی منصوبہ سازی کی اور ایک مضحکہ خیز بات یہ ہوئی کہ جمال عبدالناصر جیسے دین بیزار شخص کی طرف منسوب کر کے اس کا نام "موسوعۃ جمال عبدالناصر فی الفقہ الاسلامی" رکھ دیا گیا، موسوعۃ کے لیے مقررہ یہ کمیٹی کام کر رہی ہے اور اب تک اس کی پندرہ سولہ جلدیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں، اس موسوعۃ میں حنفیہ، مالکیہ، شوافع، حنابلہ اور ظاہریہ کے علاوہ امامیہ، زیدیہ اور اباضیہ فرقوں کے نقطۂ نظر کو بھی ضروری دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اُصولِ فقہ اور قواعدِ فقہ کو بھی شامل رکھا گیا ہے۔

اسی طرح کی ایک اور کوشش "جمعیۃ الدراسات الاسلامیہ قاھرہ" نے شیخ محمد ابوزہرہ کی صدارت میں شروع کی تھی، جس میں مذکورہ آٹھوں مذاہب کا نقطۂ نظر جمع کرنا پیشِ نظر ہے؛ لیکن غالباً یہ کوشش منظرِ عام پر نہیں آسکی ہے۔

اس سلسلہ کی سب سے کامیاب اور نتیجہ خیز کوشش وزارتِ اوقاف کویت کی طرف سے ہوئی ہے، جس نے 1966ء میں "الموسوعۃ الفقہیہ" کے منصوبہ کو منظوری دی اور اس مقصد کے لیے فقہی موسوعہ کا تصور پیش کرنے والی پہلی شخصیت ڈاکٹر زرقاء کی خدمات حاصل کیں، اس موسوعہ میں بھی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری، زیدی، اثناءعشری اور اباضی نقاطِ نظر کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، یہ عظیم الشان کام پینتالیس جلدوں میں مکمل ہو چکا ہے اور واقعہ ہے کہ اس موضوع پر ایک تاریخی علمی کام ہوا ہے، جو یقیناً فقہ اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کا حصہ ہے، مقامِ مسرت ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اس موسوعہ کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے، تادمِ تحریر چالیس جلدوں کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے اور اس وقت نظرِ ثانی اور مراجعت کے آخری مراحل میں ہے، دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی اشاعت کو آسان فرمائے اور اُردو دنیا کو اس عظیم علمی ذخیرہ کے ذریعہ شاد کام کرے۔

انسائیکلوپیڈیائی کاوشوں میں ڈاکٹر رواس قلعہ جی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ انھوں نے عہدِ صحابہ اور عہدِ تابعین کے ان فقہاء کی آراء کو یکجا، منضبط اور مرتب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، جن کے اقوال مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے اور سلف کا ایک بہت بڑا علمی اور فقہی ورثہ لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہوتا جا رہا

تھا، ڈاکٹر رواس نے الف بائی ترتیب سے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حسن بصری اور ابراہیم نخعی وغیرہ کی فقہ کو جمع کیا ہے اور اس طرح اہلِ علم کی نئی نسل کو ابتدائی دور کے فقہاء کے اجتہادات سے مربوط کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، فجزاہم اللہ خیرالجزاء۔

(۷) اس عہد میں ایک بہتر رجحان نئے مسائل پر اجتماعی غور وفکر کا بھی پیدا ہوا ہے، جس میں مختلف فقہی مذاہب کے اہلِ علم سے استفادہ کیا جائے اور اس دور کی مشکلات کو حل کیا جائے؛ چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کی مؤتمر منعقدہ مکہ مکرمہ 1384ھ میں "مجمع الفقہ الاسلامی" کے سلسلہ میں ڈاکٹر مصطفیٰ زرقاء نے نہایت اہم تجویز پیش کی، یہ تجویز قبول کی گئی، مجمع کی تشکیل عمل میں آئی چنانچہ اب تک اس کے دسیوں اجلاس ہو چکے ہیں اور کئی درجن مسائل زیر بحث آچکے ہیں، ان ہی خطوط پر زیادہ وسعت کے ساتھ 1983ء میں جدہ (O.I.C) کے تحت فقہ اکیڈمی کی تشکیل ہوئی، جو اس وقت عالمی سطح پر سب سے زیادہ باوقار اور فعال اکیڈمی سمجھی جاتی ہے 2004ء تک اس اکیڈمی کے ۱۴/ سیمینار ہو چکے تھے اور اس میں 133 مسائل زیر بحث آچکے تھے، ان دونوں اکیڈیمیوں کے سمیناروں کی تجاویز کا اُردو ترجمہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا سے شائع ہو چکا ہے؛ اسی طرح یوروپ میں "یوروپی افتاء کونسل" قائم ہے، جس کا مرکز برطانیہ ہے اور جس کے عالم اسلام میں اور بھی کئی ادارے ہیں جو خاص کر مسلمانوں کو درپیش جدید فقہی مسائل کو اجتماعی غور وفکر اور تبادلہ خیال کے ذریعہ حل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

ہندوستان کے علماء نے بھی اس سمت میں کوششیں کی ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء نے مجلس تحقیقاتِ شرعیہ اور جمعیۃ علماءِ ہند نے "ادارۃ المباحث الفقہی'' کو اسی مقصد کے تحت قائم کیا تھا، پاکستان میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا محمد یوسف بنوری وغیرہ نے " مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کی بنیاد رکھی تھی، ان مجالس نے وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کئے ہیں اور متعدد مسائل پر تبادلہ خیال کیا گیا ہے؛ لیکن مسائل کی رفتار کے اعتبار سے کام آگے نہیں بڑھ سکا؛ کیونکہ ان اداروں کی حیثیت ضمنی تھی اور جن تنظیموں اور اداروں کے تحت یہ رکھا گیا تھا، ان کے کام کا دائرہ خود بہت وسیع ہے۔

اسی پس منظر میں 1989 میں حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی نے اسلامک فقہ اکیڈمی کی

بنیاد رکھی، اکیڈیمی نے اب تک 15 سیمینار کیئے ہیں اور ان سیمیناروں میں پچاس سے زیادہ مسائل زیر بحث آئے ہیں، ان سیمیناروں میں پیش کیئے جانے والے مقالات کی 20 سے زیادہ ضخیم جلدیں طبع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں، اس کے علاوہ فقہی تحقیق اور نئی نسل کو صحیح خطوط پر تربیت کے سلسلہ میں اکیڈیمی نے نہایت اہم اور نا قابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

(۸) اس عہد سے پہلے عام طور پر فقہی ذخیرہ عربی زبان ہی میں ہوا کرتا تھا، یا چند کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئی تھیں؛ لیکن موجودہ عہد میں فقہ کے عربی ذخیرہ کو اُردو اور دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کا ذوق پیدا ہوا اور مختلف علاقائی اور عالمی زبانوں میں فقہ کے موضوع پر یا تو ترجمے کیئے گئے، یا مستقل طور پر کتابیں لکھی گئیں، ان زبانوں میں اُردو زبان کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت اُردو زبان میں علوم اسلامی اور فقہ کا جتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے، عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے؛ بلکہ بعض کتابیں تو ایسی ہیں کہ عربی وانگریزی میں بھی ان کے ترجمے ہوئے اور انھیں قبول عام و خاص حاصل ہوا، ان میں اُصولِ فقہ، تاریخ فقہ، قواعدِ فقہ، فقہ کے تمام ابواب کو جامع اور فقہ کے کسی ایک باب پر نیز فقہ حنفی، فقہ شافعی اور فقہ سلفی سے متعلق ہر طرح کی کتابیں موجود ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ بہت سی کتابیں نایاب ہوجانے، یا ان تک رسائی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے چھوٹ بھی گئی ہوں گی؛ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اس موضوع پر اُردو زبان میں کم وبیش ڈیڑھ ہزار تالیفات موجود ہیں اور یقیناً یہ اُردو زبان کی بڑی سعادت اور اس کے لیے تمغہ افتخار ہے، 2000ء تک کے جائزہ کے مطابق 1247 کتابیں موجود ہیں۔

بہر حال بعض حضرات ہر زمانے میں ایسے رہے جو قرآن وحدیث کے علوم میں ماہر، فہم وبصیرت میں اعلی، تقویٰ اور طہارت میں فائق اور حافظہ وذکاوت میں اوقع تھے لوگ ان ہی سے مسائل معلوم کر کے عمل کرتے اور اپنی فہم وبصیرت پر بالکل اعتماد نہیں کرتے اور اگر ہر کوئی خود ہی اپنے مسئلہ کو قرآن وحدیث میں تلاش کرنے لگے تو گویا ایسا ہی ہوجائے گا جیسے کہ ہر شخص اپنے مرض کا علاج خود ہی طبی کتابوں میں تلاش کرلے ڈاکٹر وغیرہ کی اس کو ضرورت ہی نہیں اگر ایسا ہوا تو کیا ہر مریض اپنے مرض کا علاج ان کتابوں میں

تلاش کر پائے گا؟ بالکل اسی طرح دینی وشرعی مسئلہ کو سمجھیں کہ اس کا حل ہر کوئی نہیں کرسکتا۔

بہر حال جو لوگ قرآن وحدیث کو مکمل طور پر سمجھے ہیں اور اپنی مکمل زندگی کو مسائل کے حل کرنے اور قرآن وحدیث کے مطابق اس کو ڈھالنے میں وقف کر دیا اور ہر مسئلہ کا جواب قرآن وحدیث اور اس کے مطابق اصول کی روشنی میں بتایا ان میں مقبول چار حضرات کے مکاتب فکر ہوئے ہیں جن کے نام یہ ہیں، حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام شافعی، حضرت امام مالک اور حضرت امام احمد بن حنبل، ان حضرات کے بعد ان کے شاگرد حضرات ہر ایک کا مسئلہ قرآن وحدیث اور ان حضرات کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق بتلایا کرتے تھے اسی طرح یہی معمول اب تک چلا آیا اور آئندہ بھی چلتا رہے گا (انشاءاللہ)۔

فقہ اسلامی کے مصادر

چونکہ اسلامی نقطہ نظر سے قانون کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک ہے، اس لیے تمام قوانین کا رشتہ بہرحال اللہ تعالیٰ ہی سے ہے؛ البتہ بعض احکام کی نسبت صراحتاً اللہ اور اُس کے رسول کی طرف ہے اور بعض احکام قرآن وحدیث سے ثابت ہونے والے اصول وقواعد کی روشنی میں اہلِ علم نے استنباط کیے ہیں، ان کی بھی بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی جاسکتی ہے، فرق یہ ہے کہ پہلا ذریعہ معصوم ہے؛ اگر قرآن وحدیث سے اس کا ثبوت یقینی ہو تو اس میں غلطی کا احتمال نہیں اور دوسرا ذریعہ معصوم نہیں؛ کیونکہ اس میں انسانی اجتھاد کو دخل ہے اور انسان کی سوچ غلط بھی ہوسکتی ہے، اس طرح فقہ اسلامی کے مصادر کو دوحصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) نصوص (۲) اجتہاد کے دوسرے مسائل۔

1۔ منصوص مصادر

فقہ اسلامی کے منصوص مصادر چار ہیں:

(۱) کتاب اللہ

(۲) سنت رسول اللہ

(۳) شرائع ماقبل

(۴) جن مسائل میں اجتھاد کی گنجائش نہ ہو ان میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار۔

اول۔ کتاب اللہ

کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے، جو بے کم وکاست محفوظ ہے اور قیامت تک رہے گا، قرآن مجید میں فقہی احکام سے متعلق آیات کی تعداد لوگوں نے دو ڈھائی سو سے لیکر پانچ سو تک لکھی ہے، پانچ سو کی تعداد اس لحاظ سے ہوسکتی ہے کہ قرآن سے ثابت ہونے والے صریح احکام کے علاوہ اصولی احکام کو بھی شامل کرلیا

جائے، ملاجیون نے تفسیرات احمدیہ میں اسی اصول پر آیات کا انتخاب کیا ہے، جن کی تعداد 462 ہے۔ شیخ عبدالوہاب خلاف نے عبادات کے علاوہ دوسرے مسائل سے متعلق آیات کی تعداد اس طرح لکھی ہے:

عائلی قوانین (70)	قانون شہریت (70)
احکام جرم وسزا (301)	عدالتی قوانین (13)
دستوری قوانین (10)	اقتصادی قوانین (10)
قومی وبین قومی قوانین (25)	

(علم اصول الفقہ للخلاف، صفحہ نمبر 31)

فقہی احکام کی اہمیت اور عملی زندگی سے اس کے تعلق کی وجہ سے بہت سے اہل علم نے آیات احکام کی تفسیر کا اہتمام کیا ہے، ان میں اہم کتابیں اس طرح ہیں:

احکام القرآن: امام ابوبکر حصاص رازی، متوفی: 370ھ

احکام القرآن: ابوبکر احمد بیہقی، متوفی: 458ھ

احکام القرآن: ابوبکر محمد بن عربی، متوفی: 543ھ

تفسیرات احمدیہ: ملا احمد جیون، متوفی: 1130ھ

نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام: نواب صدیق حسن خان، متوفی: 1307ھ

احکام القرآن: مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا ادریس کاندھلوی اور مفتی شفیع صاحب عثمانی کی مشترکہ کوششوں سے مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ علیہ کی زیر نگرانی مرتب ہوا ہے، جو اپنے موضوع پر بہت مفصل اور جامع مجموعہ ہے۔

روائع البیان فی تفسیر آیات الاحکام من القرآن: شیخ محمد علی صابونی

تفسیر آیات الاحکام: محمد علی السائس، عبداللطیف السبکی، محمد ابراہیم محمد کرشون

ان کے علاوہ علامہ ابوعبداللہ محمد قرطبی متوفی 670ھ کی الجامع لاحکام القرآن اور مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی متوفی: 1225ھ کی التفسیر المظہری اگرچہ پورے قرآن کی تفسیر ہے، لیکن اس پر فقہی رنگ غالب

ہے اور قرآن کے فقہی احکام پر بہت شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

دوم۔سنت رسول

احکامِ شرعیہ کا دوسرا ماخذ سنت رسول ہے، سنت رسول سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، آپ کا عمل نیز وہ قول وفعل ہے جو آپ کے سامنے آیا ہو اور آپ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی ہو، سنت کے حجت ہونے پر امت کا اجماع واتفاق ہے؛ کیونکہ قرآن مجید میں کثرت سے مستقل طور پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، فرمایا گیا کہ رسول کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے، "مَن یطِعِ الرسول فقد اطاع الله" (النسا:80) نیز اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے:

وما اٰتکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنه فانتھوا (الحشر:۷)

رسول جو کچھ لائے اسے قبول کرو اور جس سے منع کردے اس سے رک جاؤ۔

نیز سنت رسول اصل میں قرآن مجید کی تفسیر وتوضیح ہے؛ اسی لیے امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں تین طرح کی ہیں، یا تو قرآن میں جو حکم ہے وہی سنت رسول میں بھی ہے، یا قرآن میں کوئی حکم مجمل ہے اور سنت نے اس کو واضح کردیا ہے، یا قرآن مجید اس سلسلہ میں خاموش ہے اور سنت کے ذریعہ اس صورت کا حکم معلوم ہوتا ہے۔

(الرسالہ:91، باب ما ابان اللہ لخلقہ من فرضہ علی رسولہ اتباع اوحی اللہ)

لیکن غور کیا جائے تو یہ صورت بھی قرآن مجید کے بتائے ہوئے اصولوں کے دائرہ میں آتی ہے، گویا قرآن نے ایک اصول بیان کردیا اور سنت کے ذریعہ اس کی تطبیق اور عملی صورتگری سامنے آگئی؛ اس لیے امام اوزاعی نے فرمایا کہ بیان وضاحت اور فہم مراد کے اعتبار سے قرآن کو حدیث کی حاجت زیادہ ہے، بمقابلہ اس حاجت کے جو حدیث کو قرآن کی ہے۔

جو احادیث احکامِ فقہیہ سے متعلق ہیں ان کی تعداد تقریباً سات آٹھ ہزار ہے، کتبِ احادیث میں چونکہ مختلف سندوں سے آنے والی روایتوں کو مختلف حدیث شمار کرلیا جاتا ہے اس لیے ان کی تعداد زیادہ معلوم

ہوتی ہے، لیکن مکررات کو چھوڑ کر اصل مضمون اور متن کے اعتبار سے احادیثِ احکام کی تعداد سات آٹھ ہزار سے زیادہ نہ ہوگی، جن مصنفین نے ایسی حدیثوں کے جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے ان میں ہمارے علم کے مطابق مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ علیہ کی کتاب ''اعلاء السنن'' سب سے زیادہ جامع ہے، انہوں نے مولانا تھانوی رحمہ اللہ کی سرپرستی میں یہ کام انجام دیا اور احادیث احکام کو بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اس میں احادیث وآثار کی مجموعی تعداد چھ ہزار ایک سو بارہ ہے؛ جبکہ دوسری کتابیں جو اس موضوع پر ہیں ان میں اس سے بہت کم تعداد ہیں۔

احادیثِ احکام سے متعلق کتابیں اسی طرح کی ہیں، ایک وہ جس میں مختلف مضامین کی احادیث ہیں؛ لیکن احادیثِ احکام کی بھی ایک بڑی تعداد اس میں شامل ہے، چاہے اس کی ترتیب فقہی ہو یا نہ ہو، فقہی ترتیب پر جو کتابیں ہوں ان کو سنن کہا جاتا ہے؛ ایسی کتابیں جو سنن نہیں ہیں؛ لیکن ان میں احکام سے متعلق حدیثیں بکثرت ہیں وہ بہت ہیں؛ لیکن ان میں مشہور اور اہم کتابیں یہ ہیں:

بخاری شریف: امام محمد بن اسماعیل متوفی: 256ھ

مسند ابوداود: امام سلیمان بن داود طیالسی، متوفی: 204ھ

مسلم شریف: امام مسلم بن حجاج نیشاپوری، متوفی: 261ھ

المعجم الکبیر: امام ابوقاسم سلیمان بن احمد طبرانی، متوفی: 360ھ

صحیح ابن خزیمہ: امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ، متوفی: 311ھ

المعجم الاوسط: امام ابوقاسم سلیمان بن احمد طبرانی، متوفی: 360ھ

مسند امام احمد بن حنبل: امام احمد بن محمد بن حنبل، متوفی: 241ھ

المعجم الصغیر: امام ابوقاسم سلیمان بن احمد طبرانی، متوفی: 360ھ

مسند بزار: امام ابوبکر احمد بن عمرو بن بزار، متوفی: 292ھ

مستدرک حاکم: امام ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری، متوفی 405ھ

جو کتب احادیث فقہی ترتیب پر جمع کی گئی ہیں،

ان میں سے اہم کتابیں یہ ہیں:

موطا امام مالک: امام مالک بن انس، متوفی: 179ھ

موطا امام محمد: امام محمد بن حسن شیبانی، متوفی: 189ھ

کتاب الآثار: امام یعقوب ابو یوسف، متوفی: 182ھ

کتاب الآثار: امام محمد بن حسن شیبانی، متوفی: 189ھ

مصنف ابن ابی شیبہ: ابو بکر عبد اللہ بن محمد ابی شیبہ کوفی، متوفی: 235ھ

مصنف عبد الرزاق: ابو بکر عبد الرزاق صنعانی، متوفی: 211ھ

سنن ترمذی: امام محمد بن عیسی بن سورہ ترمذی، متوفی: 279ھ

سنن ابوداود: ابوداود سلیمان سجستانی، متوفی: 275ھ

سنن نسائی: ابو عبد الرحمٰن احمد بن علی نسائی، متوفی: 215ھ

سنن دارمی: امام عبد اللہ بن عبد الرحمٰن دارمی، متوفی: 255ھ

سنن ابن ماجہ: امام محمد بن زید بن ماجہ قزوینی، متوفی: 273ھ

سنن دار قطنی: علی بن عمر دار قطنی، متوفی: 285ھ

سنن بیہقی: حافظ ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، متوفی: 458ھ

کچھ کتابیں وہ ہیں جن کے مصنفین نے کتب احادیث کی روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور ان میں احادیث احکام کا بہت بڑا حصہ آگیا ہے؛ اس سلسلہ میں درج ذیل کتابیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

جامع الاصول من احادیث الرسول:

یہ کتاب علامہ ابن اثیر کی ہے، جس میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداود، نسائی اور موطا امام مالک کی

احادیث کوجمع کیا گیا ہے۔

مجمع الزوائد ومنبع الفوائد:

یہ حافظ علی بن ابی بکر ہیثمی کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے مسند احمد، مسند ابویعلی موصلی، مسند بزار اورطبرانی کی تینوں معاجم کی ان زائد احادیث کوجمع کیا ہے جوصحاح ستہ میں موجود نہیں ہیں اور ضعیف احادیث کے درجہ اور مقام کو واضح کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے، اس طرح اس میں احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔

الجامع الصغیر من احادیث البشیرالنذیر:

یہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ علیہ کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے (۱۳۱۰۱) حدیثیں سند کو حذف کرکے حروفِ تہجی کی ترتیب سے جمع کی ہیں اور ہر حدیث پر حدیث کے درجہ کی طرف رمزیہ الفاظ کے ذریعہ اشارہ بھی کیا ہے، پھر جو حدیثیں اس میں باقی رہ گئیں ان کو الفتح الکبیر کے نام سے جمع فرمایا، البتہ اس میں درجہ کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے، واقعہ ہے کہ ہر طرح کی حدیثوں کا یہ بہت بڑا ذخیرہ ہے؛ پھر اس کی بنیاد پر علامہ سیوطی رحم ؟ اللہ علیہ نے الجامع الکبیر مرتب کی، جس میں قولی احادیث کی ترتیب حروفِ تہجی پر ہے اور فعلی احادیث کی ترتیب صحابہ کے نام پر ہے۔

جمع الفوائد بن جامع الاصول ومجمع الزوائد:

یہ محمد بن سلیمان مغربی کی تالیف ہے، جنہوں نے علامہ ابن اثیر کی جامع الاصول اور علامہ ہیثمی کی مجمع الزوائد کی احادیث کوجمع کرنے کے علاوہ سنن ابن ماجہ اور سنن دارمی کی ان زائد احادیث کو بھی شامل کرلیا ہے جوصحاح ستہ میں موجود نہیں ہیں، اس کتاب میں حدیث کی چودہ اہم کتابوں کی احادیث یکجا ہوگئی ہیں اور اس طرح یہ کتاب احادیثِ نبوی کا عظیم انسائیکلوپیڈیا بن گئی ہے۔

کنزالعمال فی سنن الاقوال والافعال:

یہ علامہ علاءالدین علی متقی ہندی کی تالیف ہے، آپ رحمہ اللہ علیہ نے پورے ذخیرہ احادیث کو

موضوعات کی ترتیب پر مرتب فرمایا ہے، یہ کتاب اس وقت احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے جو ۴۲۶۶۴/احادیث وآثار پر مشتمل ہے۔

بعد کے اہلِ علم نے کتب احادیث سے سند کو حذف کر کے صرف احادیث احکام کو جمع کرنے کی سعی کی ہے،اس سلسلے میں درج ذیل کتب اہم ہیں:

الاحکام:عبدالغنی مقدسی

عمدۃ الاحکام من سیدالانام :عبدالغنی مقدسی

الالمام لاحاد یث الاحکام:ابن دقیق العبد

المنتقی فی الاحکام:عبدالسلام بن عبداللہ بن تیمیہ حرانی

بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام:حافظ ابن حجر عسقلانی

آثارالسنن:علامہ ظہیراحسن شوق نیمومی

اعلاء السنن:مولانا ظفراحمد عثمانی رحمہ اللہ علیہ

اس کے علاوہ احادیث احکام کا بہت بڑا حصہ ان کتابوں میں بھی آ گیا ہے جن میں کسی فقہی کتاب کی مرویات کی تخریج کی گئی ہے،اس سلسلہ میں یہ کتابیں نہایت اہم اور احادیث احکام سے متعلق فنی مباحث کی جامع ہیں:

"نصب الرایہ لاحادیث الھدایہ،

الدرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ، التلخیص الحبیر

البدرالمنیر فی تخریج الاحادیث والآثار الواقع؟ فی الشرح الکبیر"۔

احادیث احکام کے سلسلے میں دواور خدمتیں قابل ذکر ہیں: ایک وہ جو مسند احمد بن حنبل پر کی گئی ہے، مسند احمد بن حنبل 27634 احادیث پر مشتمل ہے، جو زیادہ تر صحیح اور حسن کے درجہ کی ہیں؛ مگر چونکہ اس کی ترتیب صحابہ کے ناموں پر ہے،اس لیے اس سے احادیثِ احکام کا نکالنا بہت دشوار کام تھا، علامہ احمد بن

عبدالرحمٰن البنا نے الفتح الربانی کے نام سے اس کتاب کی مرویات کو فقہی ترتیب پر جمع کیا ہے اور اس کی نہایت عمدہ اور بصیرت افروز شرح بھی کی ہے، اس خدمت نے اہلِ علم کے لیے مسند احمد سے استفادہ کو آسان کر دیا ہے، حدیث کی اہم خدمات میں ایک صحیح ابن حبان بھی ہے، جو کتبِ حدیث کی عام ترتیب سے مختلف ہے، اس لیے اس سے استفادہ دشوار تھا؛ چنانچہ کمال یوسف الحوت نے "الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان" کے نام سے موضوع وار احادیث کو مرتب کیا ہے اور اس طرح فقہی موضوعات پر بھی اس کتاب سے استفادہ آسان ہوگیا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ احکامِ شرعیہ میں عبادات اور حدود کا غالب ترین حصہ احادیث ہی پر مبنی ہے، اس لیے فقہ اسلامی کے مصادر میں حدیث کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اس سلسلہ میں محدثین نے جو سعی بے پایاں کی ہے، مذاہب کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھئے "حدیث کی تشریعی حیثیت" "حدیث رسول اور فقہ اسلامی" اور "ضعیفِ حدیث اور قوت استدلال"۔

سوم: آثارِ صحابہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دین کو براہ راست حضرات صحابہ نے حاصل کیا ہے اور انہی کے واسطہ سے یہ دین پوری امت تک پہنچا ہے، صحابہ سب کے سب عادل، معتبر، خداترس اور مخلص تھے: لہٰذا ان کے اقوال اور آراء کی خاص اہمیت ہے، بعض مسائل تو ایسے ہیں جن میں رائے اور اجتھاد کی گنجائش ہے اور بعض مسائل وہ ہیں جسے کوئی شخص اپنے اجتھاد سے اخذ نہیں کرسکتا، بلکہ لازماً ان کی بنیاد قرآن وحدیث ہی پر ہوگی، اس دوسرے قسم کے مسائل میں صحابہ کی رائے احناف ومالکیہ کے نزدیک حجت اور دلیل ہے، اس لیے کہ ان کی رائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی کسی بات پر ہی مبنی ہوگی، گویا یہ بھی حدیث ہی کے درجہ میں ہے، آثار صحابہ کے نقل کرنے کا زیادہ اہتمام مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق میں کیا گیا ہے اور موجودہ دور میں اس سلسلہ کی بہت قابلِ قدر خدمت ابوعبداللہ سید بن کسروری نے کی ہے کہ انہوں نے اپنے

علم ودانست کے مطابق تمام آثار صحابہ کو "موسوعہ آثار الصحابہ" کے نام سے تین جلدوں میں جمع کردیا ہے، جس میں 9195 آثار ہیں، آثار صحابہ حدیث ہی میں داخل ہیں، آثار صحابہ کی مزید تفصیل کے لیے دیکھئے "فقہ اسلامی میں اقوال صحابہ کا مقام"۔

چہارم: شرائع ماقبل

تمام پیغمبروں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو دین بھیجا ہے وہ ایک ہی دین ہے، اعتقادی اور اخلاقی احکام میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا ہے؛ اس لیے کہ اس کا سرچشمہ ایک ہی ذات ہے اور اگر عقیدہ واخلاق کی ہدایت میں کوئی فرق پایا جاتا ہو تو یقینی طور پر یہ انسانی تحریفات اور آمیزش کا نتیجہ ہے؛ البتہ "عملی زندگی" کے احکام جو فقہ کا اصل موضوع ہے، مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں؛ کیونکہ انسانی تمدن کے مرحلہ بہ مرحلہ ارتقاء کا تقاضہ یہی تھا، پہلی قسم کے احکام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"شرع لکم من الدین ماوصیٰ به نوحا والذی اوصینا الیك وماوصینا به ابراهیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه۔ (الشوریٰ: ۳۱)

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم وموسی (علیہما السلام) کو (مع ان سب کے اتباع کے) حکم دیا تھا (اور ان کی امم کو یہ کہا تھا) کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

اور دوسری قسم کے احکام کے بارے میں ارشاد ہے:

"لکل جعلنا منکم شرعة ومنهاجا (المائدہ: ٨٤)

تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک (خاص) شریعت اور راہ رکھی ہے۔

اس پس منظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ گذشتہ شریعتوں کے احکام کی کیا حیثیت ہوگی، اس سلسلہ میں اہل علم نے جو گفتگو کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پچھلی کتابوں میں جو احکام آئے ہیں وہ چار طرح کے ہیں:

اول وہ احکام جن کا قرآن وحدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے، بالاتفاق اس امت میں وہ احکام قابل

عمل نہیں ہیں۔

دوسرے وہ احکام جن کا قرآن وحدیث میں ذکر آیا ہے اور یہ بات بھی واضح کردی گئی ہے کہ یہ حکم سابقہ امت کے لیے تھا، اس امت میں یہ حکم باقی نہیں بلکہ منسوخ ہو چکا ہے، اس کے بارے میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ امت محمدیہ میں اس حکم پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

تیسرے وہ احکام ہیں جو قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں اور یہ بھی بتادیا گیا کہ یہ احکام اس امت کے لیے بھی ہیں، بالاتفاق اس شریعت میں بھی ان احکام پر عمل کیا جائے گا۔

چوتھے وہ احکام ہیں جن کو قرآن وحدیث نے پچھلی قوموں کی نسبت سے بیان کیا ہے؛ لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ اس امت کے لیے یہ حکم باقی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں دونظریہ ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اس امت کے لیے بھی یہ حکم باقی ہے، احناف اسی کے قائل ہیں اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اس امت کے لیے یہ حکم باقی نہیں (الاحکام للآمدی) لیکن یہ اختلاف عملی اعتبار سے زیادہ اہم نہیں ہے؛ کیونکہ عملاً شاید ہی کسی مسئلہ میں اس کی وجہ سے اختلاف رہا ہو، شرائع ماقبل جو منسوخ نہیں ہوئی ہیں وہ کتاب اللہ میں داخل ہیں، شرائع ماقبل کی مزید تفصیل کے لیے دیکھئے "فقہ اسلامی میں سابقہ شریعت کا مقام"۔

غیر منصوص مصادر

اول: اجماع

جن شرعی دلائل کا ماخذ انسانی اجتہاد ہے ان میں سب سے قوی اجماع ہے؛ اجماع سے مراد کسی رائے پر رسول اللہصلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت کے مجتہدین کا متفق ہو جانا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لاتجمع امتی علی الضلالة (داود، ترمذی) کہمیر ی امت کسی غلط بات پر متفق نہیں ہوسکتی؛ گویا امت کے افراد کے انفرادی اجتہاد میں تو خطا کا احتمال ہے، لیکن اجتماعی حیثیت میں وہ معصوم ہیں اور کسی غلط بات پر متفق نہیں ہو سکتے۔

اجماعی احکام میں کچھ تو وہ ہیں جن کی بنیاد احادیث پر ہے، یعنی ایک حکم خبر واحد سے ثابت ہوا اور بعد کو تمام فقہاء اس پر متفق ہو گئے، اس طرح اس مسئلہ پر اجماع منعقد ہو گیا اور اجماع کی وجہ سے اس حکم نے قطعی اور یقینی حکم کا درجہ حاصل کر لیا اور کچھ احکام وہ ہیں جن کی بنیاد قیاس و مصلحت پر ہے اور اس میں اجتہاد اور ایک سے زیادہ نقطہ نظر کی گنجائش ہے، اس طرح کے احکام میں زیادہ تر اجماع کا انعقاد عہدِ صحابہ میں ہوا ہے، کیونکہ اس عہد میں تمام مجتہدین کی آراء سے واقف ہونا آسان تھا، خاص کر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے اجتماعی غور وفکر اور شورائی اجتہاد کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا، اس لیے ان کے عہد میں نسبتاً زیادہ اجماع منعقد ہوئے۔

اجماعی احکام پر اہم تالیف علامہ ابن منذر متوفی: 318 ھ کی " کتاب الاجماع" ہے، جس میں 765 اجماعی مسائل کا ذکر آیا ہے، اس سلسلہ میں ایک اہم خدمت اس دور میں سعدی ابوحبیب نے کی ہے اور "موسوعۃ الاجماع" کے نام سے تمام اجماعی احکام کا احاطہ کرنے کی سعی کی ہے، اس کتاب میں 1304 اجماعی مسائل ذکر کئے گئے ہیں، یہ کتابیں ان معترضین کی تردید کرتی ہیں جن کے نزدیک اجماع کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ عملاً اجماعی مسائل کا وجود نہیں، اجماع کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھئے "اجماع امت، فقہ اسلامی کا تیسرا ماخذ"۔

دوم: قیاس

غیر منصوص مصادر میں سے ایک قیاس بھی ہے، قیاس کے اصل معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے برابر کرنے کے ہیں، کسی مسئلہ کے سلسلے میں قرآن وحدیث کی صراحت موجود نہ ہو؛ لیکن قرآن وحدیث میں اس سے ملتا جلتا کوئی مسئلہ موجود ہو اور اس مسئلہ میں اللہ اور رسول کے حکم کی جو وجہ ہوسکتی ہو وہ اس مسئلہ میں بھی موجود ہو؛ چنانچہ یہاں بھی وہی حکم لگا دیا جائے، اس کو قیاس کہتے ہیں، غور کیا جائے تو قیاس قرآن وحدیث کے مقابلہ میں دی جانے والی رائے نہیں ہے؛ بلکہ قیاس کے ذریعہ قرآن وحدیث کے حکم کے دائرہ کو وسیع کیا جاتا ہے۔

جن مسائل کی بابت نص موجود نہ ہو ان میں قیاس پر عمل کیا جائے گا، یہ بات تقریباً متفق علیہ ہے، شرعی دلیلوں میں قیاس کو چوتھے درجہ پر رکھا گیا ہے؛ لیکن حدیث وقیاس یہ دونوں ایسے مصادر ہیں جن سے بیشتر فقہی احکام متعلق ہیں اور معاملات کے احکام کی بنیاد تو بڑی حد تک قیاس ہی پر ہے؛ اس لحاظ سے یہ نہایت اہم ماخذ ہے، تفصیل کے لیے دیکھئے "قیاس، حقیقت وضرورت"۔

دوسرے دلائل

ان دونوں کے علاوہ کچھ اور غیر منصوص مصادر ہیں جن سے وقتاً فوقتاً فقہ اسلامی میں مدد لی جاتی ہے، مثلاً:

سوم: استحسان

استحسان کی بہت ساری تعریفات ہیں:

۱۔ عوام اور خواص کی سہولت اور راحت کی وجہ سے قیاس جلی کو ترک کردیا اور مستحسن کو اختیار کرنا۔ (الجوہر ۱۱۳ ج ۲)

۲۔ قوی قیاس کے مقابلہ میں ظاہری قیاس کو چھوڑ دینے کا نام استحسان ہے، تفصیل کے لیے دیکھئے "استحسان" اور "فقہ اسلامی"۔

مثالیں: (۱)روزہ کی حالت میں بھول کر کچھ کھا پی لیا تو روزہ نہیں ٹوٹتا قیاس کی رو سے روزہ ختم ہوجانا چاہئے مگر حدیث شریف میں موجود ہے:

من نسی وھو صائم فاکل او شرب فلیتم صومہ فانما اطعمہ اللہ و سقاہ(متفق علیہ)

جس نے بھول کر روزے میں کچھ کھا پی لیا وہ روزہ پورا کرے اس کو اللہ ہی نے کھلایا پلایا ہے۔

اس جگہ قیاس حدیث کے معارض ہے اس لئے روزہ کے نہ ٹوٹنے کا حکم دیا ہے۔

(۲) یہ کہ کوئی چیز کاریگروں سے بنوائی اور قیمت پیشگی طے کرلی جیسا کہ آج کل بکثرت ہوتا ہے لیکن استحساناً اجماع کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا ہے حالانکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ ناجائز ہو۔

(۳) یہ کہ ناپاک کنواں یا حوض کی دیواریں ڈول رسی بیچنے والوں کے ہاتھ کنویں سے ا؟ خری ڈول نکالنے کے بعد از خود استحساناً پاک رہیں گے کیوں کہ ناپاک قرار دینے میں حرج شدید ہے۔

چہارم: مصالح مرسلہ

کتاب وسنت میں جن مصلحتوں کے معتبر ہونے کی صراحت ہے اور نہ نامعتبر ہونے کی، ان کو مصالح مرسلہ کہتے ہیں؛ اگر یہ شریعت کے مزاج اور عمومی ہدایات سے ہم آہنگ ہوں تو معتبر ہے، تفصیل کے لیے دیکھئے "مصالح مرسلہ اور فقہ اسلامی"۔

مثالیں: قرآن کریم کو مصحف کی شکل میں جمع کرنا۔ شرابی کے لئے اسّی کوڑے۔ کاریگر سے کوئی چیز ضائع ہوجائے تو اس کا تاوان دینا ہوگا۔

پنجم: استصحاب

گذشتہ زمانہ میں کسی امر کے ثابت ہونے کی وجہ سے موجودہ یا آئندہ میں بھی اس کو موجود ہی مانا جائے تو اس کو اصطلاح میں استصحاب کہتے ہیں، تفصیل کے لیے دیکھئے "استصحاب اور فقہ اسلامی"۔

استصحاب کی تعریف

استصحاب باب استفعال کا مصدر ہے اس کے معنی ہیں ساتھی بنانا، کسی کو ساتھ رہنے کی دعوت دینا۔

(المعجم الوسیط مادہ:ص ح ب)

اصولِ فقہ کی اصطلاح میں کسی حکم کو حسبِ حال بحال رکھنے کو استصحاب کہا جاتا ہے، متعدد فقہاء نے مختلف الفاظ میں اس کی تعریف کی ہے؛ چنانچہ اصولِ فقہ کی شہرہ آفاق کتاب" کشف الاسرار" میں ہے: حال میں کسی چیز کے ثبوت کا حکم محض اس بنا پر لگانا کہ وہ چیز ماضی میں موجود تھی۔ (کشف الاسرار:۳/۶۶۲)

علامہ قرافی اس طرح رقمطراز ہیں:

"و معناه ان ماثبت فی الزمان الماضی فاصل بقاء فی الزمن المستقبل"۔(البحر المحیط فی اصول الفقه،استصحاب الحال،٤/٧٢٣،انوارالبروق فی انواع الفروق،الفرق بین قاعد؟ الانشا والخبر١/٦٨)

ترجمہ: یعنی جو چیز زمانہ ماضی میں ثابت ہو اس کو مستقبل میں باقی رکھنا ہی اصل (ضابطہ) ہے۔

ان تمام تعریفات کا حاصل یہی ہے کہ کسی چیز کا وجود یا عدم زمانہ ماضی میں ثابت تھا تو اب زمانہ حال اور مستقبل میں اس چیز کو اپنی حالت پر ہی برقرار رکھا جائیگا، جب تک کہ اس کے خلاف کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے، مثلاً ایک شخص نے کوئی چیز خریدی یا اسے وہ چیز ہدیہ میں ملی یا کوئی اور طریقے سے وہ اس چیز کا مالک بن گیا، تو اب فی الحال اور مستقبل میں وہ چیز استصحاب کی وجہ سے اسی کی ملکیت متصور ہوگی، جب تک کہ کوئی ایسی دلیل واضح ہو کر سامنے نہ آجائے جو اس کی ملکیت کے ختم ہو جانے کو یقینی بنادے، محض اس احتمال سے کہ اس نے اس چیز کو فروخت کر دیا ہوگا، یا کسی کو ہبہ کر دیا ہوگا، اس کی ملکیت ختم نہیں ہوگی؛ البتہ اس بات پر بینہ قائم ہو جائے کہ اس نے اس چیز کو فروخت کر دیا ہے، یا ہبہ کر دیا ہے تو اس یقین کی وجہ سے یہ چیز اس کی ملکیت سے نکل جائیگی اور استصحاب پر عمل نہیں ہوگا۔ (نفائس الاصول:۹/۴۰۲۴)

اسی طرح کسی شخص کے متعلق مشاہدہ سے معلوم تھا کہ وہ گذشتہ زمانہ میں باحیات تھا، چند سال یا چند ماہ گذرنے کے بعد محض فوت ہونے کا احتمال اس بات کے لیے کافی نہیں کہ اس کو مردہ تصور کیا جائے؛ بلکہ جب تک کوئی واضح دلیل سامنے نہ آجائے اس کو باحیات ہی سمجھا جائے گا؛ اسی طرح ایک چیز شرعاً حلال

ہے تو مستقبل میں بھی اس کو حلال ہی تصور کیا جائیگا، ہاں اگر کوئی دلیل قائم ہو جائے جو اس کی حلت ختم ہونے کو یقینی بنا دے تو پھر اس کی حلت حرمت میں تبدیل ہو جائیگی

ششم: عرف

لوگ زندگی کے اموراور معاملات میں جس قول، فعل یا ترک فعل کے عادی ہو گئے ہوں ان کو عرف وعادت کہتے ہیں، عرف کا بدلے ہوئے حالات کے پس منظر میں احکام کی تبدیلی سے گہرا تعلق ہے، تفصیل کے لیے دیکھئے: "عرف وعادت اور فقہ اسلامی"۔

ہفتم: ذریعہ

ذریعہ کے معنی وسیلہ کے ہیں؛ لہٰذا اگر کوئی امر کسی واجب یا مستحب کا ذریعہ بنتا ہو تو وہ ذریعہ مطلوب ہوگا اور اس کو فتح ذریعہ کہتے ہیں اور حرام ومکروہ کا ذریعہ بنتا ہو تو وہ مذموم ہوگا، اس کو سدِ ذریعہ کہتے ہیں، پھر جو جس درجہ کا ذریعہ ہوگا اس نسبت سے اس کا حکم ہوگا، تفصیل کے لیے دیکھئے "سد ذرائع اور فقہ اسلامی"۔

☆..................☆..................☆..................☆

فقہ پر اعتماد نہ کرنے کا نقصان

اگرفقہ پر اعتماد نہ کر کے کوئی شخص اپنے ہر عمل کا تعلق بلا واسطہ قرآن یا حدیث سے کریگا تو یہ اجماع کے خلاف ہوگا (عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید :13) اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کے سامنے مکمل قرآنی علم یا مکمل احادیث کا مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سارے علوم وغیرہ کا ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ بعض جگہ قرآنی آیات مجمل ہیں تو بعض جگہ قرآنی آیات اور احادیث میں ابہام بھی ہے اور کچھ احادیث ایک ہی عمل کے مختلف طریقے اور مختلف حکم پیش کرتی ہے اور الفاظ قرآن یا حدیث ایک معنی پیش کرتے ہیں اور مرادی معنی اور ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سحری کے وقت کے سلسلہ میں فرمایا:

وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر۔(البقرہ: 187)

اور اس وقت تک کھاو پیو جب تک صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے ممتاز ہو کر تم پر واضح (نہ) ہو جائے۔(ترجمہ تھانوی)

بظاہر اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت تک کھا پی سکتے ہیں جب تک کہ صبح کی روشنی سے سفید اور کالے دھاگے میں امتیاز ہو جائے جیسا کہ بعض صحابہ نے ایسا ہی سمجھا تھا؛ مگر حقیقی معنی یہ نہیں ہیں؛ بلکہ خیط ابیض سے مراد صبح صادق اور خیط اسود سے مراد صبح کاذب ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو انسان اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے پانی سے دوسرے کے کھیت کو سیراب کرے۔

(مسند احمد، حدیث نمبر: 17031)

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب باغ میں پانی زیادہ ہو جائے تو اسے دوسرے کے باغ میں نہ چھوڑا جائے جیسا کہ بعض حدیث پڑھنے والے یہی معنی سمجھ کر کئی دن اسی پر عمل کرتے رہے؛ حالانکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حاملہ لونڈیوں سے صحبت نہ کی جائے؛ اس طرح بلا واسطہ قرآن و حدیث کے سمجھنے

میں غلطی ہونے کا قوی امکان ہوسکتا ہے؛ اس کے علاوہ بہت سارے نئے مسائل (خواہ وہ مسائل عبادات کے ہوں یا معاملات کے ہوں یا معاشرت کے ہوں وہ) قرآن وحدیث سے بلاواسطہ (ڈائرکٹ) نہیں سمجھ سکتا؛ بہرحال ہرانسان اپنے کم علمی کے ذریعہ زندگی کے ہرعمل کوشریعت کے مطابق نہیں بنا سکتا؛ اس لیے علوم شرعیہ کے ماہرین سے رجوع کرنا ضروری ہوگا؛ اس کے بغیر وہ اپنی زندگی کوشریعت کے منشا کے مطابق نہیں بنا پائیگا اور بہت ساری خرابیاں وجود میں آتی ہیں۔

☆........................☆........................☆..................☆

تقلید

تقلید کا لغوی معنی

تقلید کا معنی لغت میں پیروی ہے اور لغت کے اعتبار سے تقلید، اتباع، اطاعت اور اقتداء سب ہم معنی ہیں۔[مختار الصحاح:758، موسوعۃ فقہیہ:1 / 264-265، فیروز الغات:ا-ت]

تقلید کے لفظ کا مادہ "قلادہ" ہے۔جب انسان کے گلے میں ڈالا جائے تو"ہار" کہلاتا ہے اور جب جانور کے گلے میں ڈالا جائے تو"پٹہ " کہلاتا ہے۔

تقلید کا مادہ "قلادہ" ہے، باب تفعیل سے "قَلَّدَ يُقَلِّدُ تَقْلِيداً" کے معنی ہار پہننے کے ہیں؛ چنانچہ خود حدیث میں بھی "قلادہ" کا لفظ "ہار" کے معنی میں استعمال ہوا ہے:

حضرت عائشه رضی الله عنها سے مروی ھے: "استعارت من اسماء قلادة۔(بخاری)

ترجمہ:انہوں نے حضرت اسماء سے ہار عاریۃً لیا تھا۔

تقلید کا اصطلاحی معنی

☆اصولیین کے نزدیک تقلید کے اصطلاحی معنی:

دلیل کا مطالبہ کیئے بغیر کسی امام مجتہد کی بات مان لینے اور اس پر عمل کرنے کے ہیں،

قاضی محمد علی لکھتے ہیں:

"التقليد اتباع الانسان غيره فيما يقول او يفعل معتقدا للحقيقة من غير نظر الى الدليل"۔(كشف اصطلاحات الفنون:١١٧٨)

ترجمہ: تقلید کے معنی یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی دوسرے کی قول وفعل میں دلیل طلب کیئے بغیر اس کو حق سمجھتے ہوئے اتباع کرے۔

اجتہاد اور تقلید کا دائرہ

احکام کی دو قسمیں ہیں:

۱۔مسائل اصولیہ ۲۔مسائل فرعیہ

پھر مسائل فرعیہ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔منصوص ۲۔غیر منصوص

پھر منصوص کی دو قسمیں ہیں:

۱۔متعارض ۲۔غیر متعارض

پھر غیر متعارض کی دو قسمیں ہیں:

۱۔محتمل ۲۔غیر محتمل (محکم)

1۔پس جو مسائل مسائل اصولیہ ہیں ان میں نہ تقلید ہے اور نہ ہی اجتہاد۔اسی طرح جو مسائل منصوص، غیر متعارض، غیر محتمل ہیں ان میں نہ تو اجتہاد ہے اور نہ ہی تقلید۔

2۔مسائل غیر منصوص: مجتہد غیر منصوص مسائل کا حکم قواعد شرعیہ کے مطابق منصوص پر قیاس کر کے ظاہر کرتا ہے اور مقلد اسی حکم پر جو مجتہد نے کتاب وسنت سے استنباط کیا ہے عمل کرتا ہے، جیسے شوربے میں چیونٹی، دودھ میں بھڑ، شربت میں مچھر گر جائے تو کیا کیا جائے؟ کیونکہ ان کا حکم صراحۃً کتاب وسنت میں نہیں، مجتہد نے ان سب کو مکھی پر قیاس کر لیا۔

3۔مسائل منصوصہ متعارضہ: مجتہد رفع تعارض کر کے راجح نص پر عمل کرتا ہے اور مقلد بھی مجتہد کی رہنمائی میں راجح نص پر عمل کرتا ہے۔

4۔مسائل منصوصہ محتملہ: مجتہد رفع احتمال کر کے نص پر عمل کرنے کی راہ متعین کرتا ہے اور مقلد اس کی رہنمائی میں اس نص پر عمل کرتا ہے۔

یہ ہے اجتہاد اور تقلید کا دائرہ، اب جو شخص ان مسائل (غیر منصوص کا حکم، رفع تعارض، رفع احتمال) میں استنباط اور اجتہاد کرسکتا ہے وہ مجتہد کہلاتا ہے اور جو یہ اہلیت نہیں رکھتا وہ ان مسائل میں مجتہدین کی رہنمائی میں کتاب وسنت پر عمل کرے وہ مقلد کہلاتا ہے۔

جائز و ناجائز اتباع وتقلید

جس طرح لغت کے اعتبار سے کتیا کے دودھ کو بھی دودھ ہی کہا جاتا ہے اور بھینس کے دودھ کو بھی دودھ کہتے ہیں۔ مگر حکم میں حرام اور حلال کا فرق ہے اسی طرح تقلید کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اگر حق کی مخالفت کے لئے کسی کی تقلید کرے تو یہ مذموم ہے جیسا کہ کفار و مشرکین، خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لئے اپنے گمراہ وڈیروں کی تقلید کرتے تھے۔ اگر حق پر عمل کرنے کے لئے تقلید کرے کہ میں مسائل کا براہ راست استنباط نہیں کرسکتا اور مجتہد کتاب وسنت کو ہم سے زیادہ سمجھتا ہے۔ اسلیے اس سے خدا اور رسول کی بات سمجھ کر عمل کرے تو یہ تقلید جائز اور واجب ہے۔

علامہ خطیب بغدادی شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

احکام کی دو قسمیں ہیں: عقلی اور شرعی

ا......☆ عقلی احکام میں تقلید جائز نہیں، جیسے صانع عالم (جہاں کا بنانے-والا) اور اس کی صفات (خوبیوں) کی معرفت (پہچان)، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سچے ہونے کی معرفت وغیرہ. عبید اللہ بن حسن عنبری سے منقول ہے کہ وہ اصول_ دین میں بھی تقلید کو جائز کہتے ہیں، لیکن یہ غلط ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "تمہارے رب کی طرف سے جو وحی آئی اسی پر عمل کرو، اس کے علاوہ دوسرے اولیاء کی اتباع نہ کرو، کس قدر کم تم لوگ نصیحت حاصل کرتے ہو" (3/7).

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کی اتباع کرو تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں، ہم اس چیز کی اتباع کرینگے جس پر ہم نے اپنے باپ دادہ کو پایا، چاہے ان کے

باپ دادا بے عقل اور بے ہدایت ہوں" (2/170)

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ " ٹھہرالیا اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا (یعنی اللہ کے واضح احکام_ حلال وحرام کے خلاف ان کو حاکم -حکم دینے والا), اللہ کو چھوڑ کر "... (9/31)

۲......☆ دوسری قسم: احکام_ شرعیہ، اور ان کی دو قسمیں ہیں:

(الف) دین کے وہ احکام جو وضاحت وصراحت سے معلوم ہوں، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ اسی طرح زنا وشراب کا حرام ہونا وغیرہ تو ان میں تقلید جائز نہیں ہے کیونکہ ان کے جاننے میں سارے لوگ برابر ہیں، اس لئے ان میں تقلید کا کوئی معنی نہیں.

(ب) دین کے وہ احکام جن کو نظر و استدلال کے بغیر نہیں جانا جا سکتا، جیسے: عبادات، معاملات، نکاح وغیرہ کے "فروعی" مسائل، تو ان میں تقلید کرنی ہے.

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون اللّہ تعالیٰ کے قول "پس تم سوال کرو اہل_ علم (علماء) سے، اگر تم نہیں علم رکھتے" (سورہ انبیاء 7)۔

اور وہ لوگ جن کو تقلید کرنی ہے (یہ) وہ حضرات ہیں جن کو احکام_ شرعیہ کے استنباط کے طریقے معلوم نہیں ہیں، تو اس کے لئے " کسی" عالم کی تقلید اور اس کے قول پر عمل کے بغیر چارہ نہیں ہے. اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "پس تم سوال کرو اہل_ علم (علماء) سے، اگر تم نہیں علم رکھتے" (سورہ انبیاء 7)

دوسری جگہ ارشاد ہے: حالانکہ اگر یہ لوگ اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اپنے میں سے ایسی باتوں کی تہہ تک پہنچنے والوں کے حوالے کر دیتے تو اس کی حقیقت وہ لوگ معلوم کر لیتے جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو معدودے چند کے علاوہ تم سب شیطان کے پیروکار بن جاتے۔(سورۃ نساء 83)

حضرت ابن_ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دور میں زخمی ہو گیا، پھر انھیں غسل کی حاجت ہو گئی، "لوگوں" نے انھیں غسل کا حکم دے دیا جس کی وجہ سے ان کی

موت ہوگئی. اس کی اطلاع نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ نے فرمایا: اللہ ان کو قتل (برباد) کرے کہ ان لوگوں نے اس کو قتل کر دیا. ، ناواقفیت کا علاج (اہل_ علم سے) دریافت کرنا نہ تھا؟... الخ (سنن ابی داود)

دوسری اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ اہل_ اجتہاد میں سے نہیں ہے تو اس پر تقلید ہی فرض ہے. جیسے نابینا، جس کے پاس ذریعہ_ علم نہیں ہے تو قبلے کے سلسلے میں اس کو کسی دیکھنے والے (بینا) کی بات ماننی ہوگی.

مومن باپ دادا کی اتباع:

اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی (راہ) ایمان میں ان کے پیچھے چلی۔ ہم ان کی اولاد کو بھی ان (کے درجے) تک پہنچا دیں گے... (سورہ طور 21)

تقلید کی قسمیں

تقلید کی دو قسمیں ہیں: (۱) تقلیدِ مطلق (۲) تقلیدِ شخصی۔

تقلید مطلق

تقلید مطلق سے مراد یہ ہے کہ مسائل و احکام کی تحقیق میں انسان کسی ایک فقیہ کا پابند ہو کر نہ رہ جائے؛ بلکہ مختلف مسائل میں مختلف اصحاب علم سے فائدہ اٹھائے، یہ تقلید ہر زمانہ میں ہوتی رہی ہے، خود قرآن اس تقلید کا حکم دیتا ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو اور تم میں جو صاحب امر ہیں ان کی اطاعت کرو۔ (النساء:59)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کے بعد اولی الامر" کی اتباع کا حکم فرمایا گیا ہے۔ اولی الامر" سے کون لوگ مراد ہیں؛ اگرچہ اس میں علماء کی رائیں مختلف ہیں؛ لیکن اکثر مفسرین اس سے فقہاء اور علماء مراد لیتے ہیں، حاکم نے حضرت عبداللہ ابن جابر کا قول نقل کیا ہے:

اولی الامر قال الفه والخیر (مستدرك: 123/1)

ترجمہ:اولی الامر" سے مراد اصحابِ فقہ وخیر ہیں۔

ترجمان القرآن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بھی یہی تفسیر نقل کی گئی ہے:

اولی الامر یعنی اهل الفقه و الدین"۔ (مستدرك: 123/1)

ترجمہ:اولی الامر" سے اصحاب فقہ اور اہلِ دین مراد ہیں۔

پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو لوٹاؤ طرف اللہ کے اور رسول کے اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر یہ بات اچھی ہے اور بہت بہتر ہے اس کا انجام (النساء59)

مفسر امام ابوبکر جصاص رح نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہیں کہ:

"اولوالامر" کی اطاعت دینے کے فورا بعد اللہ کا یہ فرمانا کہ "پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو لوٹاؤ اللہ اور رسول کی طرف" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اولوالامر سے مراد "علماء وفقہاء" ہیں، کیونکہ اللہ نے لوگوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا (یعنی جس بات پر ان کا اتفاق و اجماع جو وہ بھی قرآن و سنّت کی بعد قطعی دلیل و حکم ہے)، "پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں" فرما کر اولوالامر (علماء) کو حکم دیا کہ جس معاملہ میں ان کے درمیاں اختلاف ہو اسے اللہ کی کتاب اور نبی کی سنّت کی طرف لوتا دو، یہ حکم "علماء وفقہاء" ہی کو ہو سکتا ہے، کیونکہ عوام الناس اور غیر عالم کا یہ مقام نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ کتاب اللہ و سنّت کی طرف کسی معاملہ کو لوٹانے کا کیا طریقہ ہے اور نہ انھیں نت نئے مسائل (کا حل قرآن و سنّت سے اجتہاد کرتے) مستنبط کرنے کے دلائل کے طریقوں کا علم ہوتا ہے، لہذا ثابت ہو گیا کہ یہ خطاب علماء وفقہاء کو ہے.

[احکام القرآن:2 / 257]

پس تم سوال کرو اہل_ علم (علماء) سے، اگر تم نہیں علم رکھتے.

اس آیت میں یہ اصولی ہدایت دیدی گئی ہے کہ جو لوگ کسی علم و فن کے ماہر نہ ہوں، انھیں چاہیے کہ اس علم و فن کے ماہرین سے پوچھ پوچھ کر عمل کرلیا کریں، یہی چیز تقلید کہلاتی ہے چناچہ علامہ آلوسی بغدادی (الحنفی) رحمہ اللہ اس طرح فرماتے ہیں: اور اس آیت میں اس بات پر بھی استدلال کیا گیا ہے کہ جس چیز کا علم اسے خود نہ ہو اس میں علماء سے رجوع کرنا واجب ہے. اور علامہ جلال الدین السیوطی (الشافعی) رحمہ اللہ

''اقلیل''، میں لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ عام آدمیوں کے لئے فروعی مسائل میں تقلید جائز ہے۔(تفسیر روح المعانی: 14/148، سورہ النحل آیت 43)

حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عالم (دینی بات جاننے والے) کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ جانتے ہوئے خاموش رہے اور جاہل (نہ جاننے والے) کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اپنی جہالت پر خاموش رہے. اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ... پس تم سوال کرو اہل_ علم (علماء) سے، اگر تم نہیں علم رکھتے. (النحل: 43 بحوالہ تفسیر_ در_ منثور)

تابعین میں، جیسے عطاء، حسن بصری وغیرہ سے بھی اولی الامر " کے معنی اہلِ علم اور اصحاب فقہ کے منقول ہیں، آیتِ مذکورہ کے علاوہ قرآن پاک کی بعض اور آیات (النساء، التوبہ) میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے، حدیثیں تو اس پر کثرت سے شاہد ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا طرزِ عمل بھی تقلید مطلق کی تائید میں ہے۔

تقلیدِ شخصی

تقلید کی دوسری قسم تقلید شخصی ہے، یعنی کسی ناواقف عامی (غیر عالم شخص) کا کسی متعین شخص کے علم و کمال پر بھروسہ کر کے اسی کے بتائے ہوئے طریقہ کار پر عمل کرنے کو تقلید شخصی کہتے ہیں.

مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت معاذ ابنِ جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا؛ تا کہ وہ لوگوں کو دین کے مسائل بتائیں اور فیصلہ کریں:

"عن معاذ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث معاذا الى اليمنِ فقال كيف تقضى فقال أقضى بما فى كتاب الله، قال فان لم يكن فى كتاب الله، قال فَبِسُنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال فإن لم يكن فى سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم قال أَجْتَهِدُ رَأْيِىَ ۔ (ترمذی، 1249) سنن ابوداؤد: جلد سوم: فیصلوں کا بیان: قضاء میں اپنی رائے سے اجتہاد کرنے کا بیان)۔

ترجمہ: جب حضور اکرم نے حضرت معاذ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا فرمایا تم کس طرح فیصلہ

کروگے جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو جائے انہوں نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا آپ نے فرمایا اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر سنت رسول میں بھی نہ پاؤ تو اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو انہوں نے کہا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور فرمایا کہ اللہ ہی کیلیئے تمام تعریفیں ہیں جس نے اللہ کے رسول کے رسول (معاذ) کو اس چیز کی توفیق دی جس سے رسول اللہ راضی ہیں۔

پس گویا اہلِ یمن کو حضرتِ معاذ کی شخصی تقلید کا حکم دیا گیا.

کن مسائل میں تقلید کی جاتی ہے؟

درج بالہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگر مجتہد کوئی مسئلہ کتاب وسنت میں نہ پائے تو اجتہاد کر سکتا ہے اور لوگوں کے لیے اس کی اتباع وتقلید ضروری ہو گی.

مثال کے طور پر چند جدید مسائل_ اجتہادیہ؛ جن کا واضح حکم نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں:

ٹیلیفون کے ذریعے نکاح

انتقال_ خون (خون کا کسی مریض کو منتقل کرنا)

اعضاء کی پیوند-کاری

حالت_ روزہ میں انجیکشن کا مسئلہ

لاؤڈ-اسپیکر پر اذان کا مسئلہ

ڈیجیٹل تصویر کا مسئلہ وغیرہ

کن کی تقلید کی جائے؟

ظاہر ہے مسائل اجتہادیہ میں مجتہد کی ہی تقلید کی جائے گی اور مجتہدین کا اصول ہے:

القیاس مظہر لا مثبت، یعنی قیاس مسائل کو ظاہر کرتا ہے ثابت نہیں۔ (شرح عقائد نسفی)

یعنی ہم کوئی مسئلہ اپنی ذاتی رائے سے نہیں بتاتے بلکہ ہر مسئلہ کتاب وسنت واجماع سے ہی ظاہر کر کے بیان کرتے ہیں

کون تقلید کرے؟

مسائل اجتہادیہ میں کتاب وسنت پر عمل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں:

جو شخص خود مجتہد ہوگا وہ خود قواعد اجتہادیہ سے مسئلہ تلاش کر کے کتاب وسنت پر عمل کرے گا۔

اور غیر مجتہد یہ سمجھ کر کہ میں خود کتاب وسنت سے مسئلہ استنباط کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، اس لیے کتاب وسنت کے ماہر سے پوچھ لوں کہ میں کتاب وسنت کا کیا حکم ہے۔اس طرح عمل کرنے کو تقلید کہتے ہیں۔

اور مقلد ان مسائل کو ان کی ذاتی رائے سمجھ کر عمل نہیں کرتا بلکہ یہ سمجھ کر کہ مجتہد نے ہمیں مراد خدا اور مراد رسول سے آگاہ کیا ہے۔

تقلیدِ شخصی حیات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں

ترجمہ: اسود بن یزید سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ ہمارے پاس معاذ (بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ) یمن میں معلم اور امیر ہو کر آئے تو ہم نے ان سے اس شخص کے متعلق پوچھا جو فوت ہو گیا اور ایک بیٹی اور ایک بہن چھوڑ کر گیا تو انہوں نے بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف دلایا۔

فائدہ: اس حدیث سے تقلید شخصی ثابت ہوتی ہے اور وہ بھی حیات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں۔ کیونکہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تعلیم_احکام اور فیصلوں کے لئے قاضی مقرر کرتے حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) کو یمن بھیجا تو اہل یمن کو اجازت دی کہ ہر مسئلے میں ان سے رجوع کریں اور یہی تقلید_ شخصی ہے، جیسا ابھی اوپر بیان ہوا۔

تقلید شخصی بعد حیات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

(1) صحیح مسلم: 4405(2388)

ترجمہ: حضرت محمد بن جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک

عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کا سوال کیا تو آپ نے اس عورت کو دوبارہ آنے کے لئے فرمایا، اس عورت نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر میں پھر آؤں اور آپ کو (موجود) نہ پاؤں؟ (یعنی آپ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں تو؟) آپ نے فرمایا اگر تو مجھے نہ پائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آجانا (اس حدیث سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بلا فصل اور تقلید_ شخصی ثابت اور واضح ہے, اس عورت کو آپ صلے الل؟ علیہ وسلم سے مسئلہ ہی تو پوچھنا تھا.[جن احادیث میں سوال کا لفظ واضح لکھا ہے:

فائدہ: "من بعدی" سے ان کی تقلید شخصی ثابت اور واضح ہے، پس ایک معین شخص کی اتباع کا حکم فرمایا اور یہ کہیں نہیں فرمایا کہ ان سے احکام کی دلیل بھی دریافت کرلیا کرنا اور نہ یہ عادت مستمرہ (جاریہ) تھی کہ دلیل کی تحقیق ہر مسئلے میں کی جاتی ہو اور یہی تقلید شخصی ہے۔ کیونکہ حقیقت تقلید شخصی یہ ہے کہ ایک شخص کو جو مسئلہ پیش آوے وہ کسی مرجح کی وجہ سے ایک ہی عالم سے رجوع کیا کرے اور اس سے تحقیق کر کے عمل کیا کرے۔.

(2) صحیح بخاری:6269)

ترجمہ: حضرت ہذیل بن شرحبیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا پھر وہی مسئلہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کی بھی ان کو خبر دی گئی تو انہوں نے اور طرح سے فتویٰ دیا، پھر ان کے فتویٰ کی خبر حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو دی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ جب تک یہ عالم متبحر تم لوگوں میں موجود ہیں تم مجھ سے مت پوچھا کرو.۔ روایت کیا اس کو بخاری، ابوداود اور ترمذی نے۔

فائدہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے اس فرمانے سے کہ ان کے ہوتے ہوئے مجھ سے مت پوچھو، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہر مسئلہ میں ان سے پوچھنے کے لئے فرمایا ہے اور یہی تقلید شخصی ہے کہ ہر مسئلہ میں کسی مرجح کی وجہ سے کسی ایک عالم سے رجوع کر کے عمل کرے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اور تقلید

اس بات میں ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے جملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شرف صحبت نبوی کے فیض و برکت سے سب کے سب عادل، ثقہ، متقی، خدا-پرست اور پاکباز تھے، مگر فہم_ قرآن، تدبر_ حدیث اور تفقہ فی الدین میں سب یکساں نہ تھے، بلکہ اس لحاظ سے ان کے آپس میں مختلف درجات اور متفاوت مراتب تھے۔

امام الفقیہ حضرت امام مسروق رح (المتوفی 23-ہجری) سے مروی ہے کہ میں نے اصحاب_ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علم کی خوشبو حاصل کی تو میں نے ان کے علم کی انتہا چھ(٦) پر پائی، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ، حضرت معاذ (بن جبل)، حضرت ابو درداء اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم۔

میں نے ان کے علم کی خوشبو پائی تو مجھے ان کے علم کی انتہا حضرت علی اور حضرت عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہم پر ملی۔[طبقات ابن سعد: 2/25، تذکرۃ الحفاظ: 1/24) اور اس روایت پر امام حاکم اور امام ذہبی رح خاموش رہے یعنی جرح نہیں فرمائی۔

معلوم ہوا کہ صحابہ کرام بھی فقہ دین (قرآن، توبہ 122) پر عمل-پیرا تھے اور اپنے دور کے چھے بڑے معتبر اصحاب کی تقلید کرتے تھے۔

کتب احادیث مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، تہذیب الآثار طبری، شرح معانی الآثار طحاوی، کتاب الآثار امام محمّد، کتاب الآثار امام ابی یوسف میں صحابہ اور تابعین کے ہزارہا فتاویٰ درج ہیں جن کے ساتھ دلائل مذکور نہیں، انہوں نے بلا-ذکر_ دلیل یہ فتاویٰ صادر فرماتے، اور سب لوگوں نے بلا-مطالبہ_ دلیل ان پر عمل کیا، یہ عمل اسلام میں پہلے دن سے آج تک تواتر سے ثابت ہے۔

تقلید پر اجماع صحابہ

اسی لئے امام غزالی (حنبلی) فرماتے ہیں: " تقلید تو اجماع صحابہ سے بھی ثابت ہے، کیونکہ وہ عوام کو

فتویٰ دیتے اور عوام کو یہ حکم نہیں دیتے تھے کہ تم (خود عربی دان ہو) اجتہاد کرو، اور یہ بات ان کے علماء اور عوام کے تواتر سے مثل_ ضروریات_ دین ثابت ہے"[المستصفی 2/386]

ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید پر اجماع

ائمہ اربعہ میں کسی ایک کی تقلید پر امت کا اجماع ہو چکا ہے، اور امت کے اجماع کی دو صورتیں ہیں:

اول یہ کہ امت کے قابل قدر علماء متفق ہو کر یہ کہیں کہ ہم نے اس مسئلہ پر اجماع کر لیا ہے، جب کہ مسئلہ کا تعلق قول سے ہو، یا اگر مسئلہ کا تعلق کسی فعل سے ہے تو وہ اس فعل پر عمل شروع کر دیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ امت کے کچھ بڑے علماء مذکورہ طریقہ پر اجماع کریں اور دوسرے قابل قدر علماء اس پر سکوت کریں اور اس پر ان کی طرف سے کوئی رد نہ ہو اس کو اجماعِ سکوتی کہتے ہیں۔

اجماع کی یہ دونوں صورتیں معتبر ہیں۔ نور الانوار میں ہے:

رکن الاجماع نوعان: عزیمة وھو التکلم منھم بما یوجب الاتفاق أی اتفاق الکل علی الحکم بان یقولوا أجمعنا علی ھذا إن کان ذلك الشیء من باب القولأو شروعھم فی الفعل إن کان من بابه۔ ورخصة: وھو أن یتکلم أو یفعل البعض دون البعض وسکت الباقون منھم ولا یردون بعد مضی مدة التأمل وھی ثلاثة أیام ومجلس العلم ویسمی ھذا اجماعا سکوتیًا وھو مقبول عندنا:219۔

چنانچہ جب علماء نے دیکھا کہ جو تقلید کا منکر ہوتا ہے وہ شتر بے مہار کی طرح زندگی بسر کرتے ہوئے اپنی خواہشات پر عمل کرتا ہے، اس لیے علماء نے ائمہ اربعہ میں کسی ایک کی تقلید پر اجماع کیا، اگرچہ ان کا یہ اجماع ایک جگہ متفق ہو کر نہیں ہوا؛ لیکن ان سب کے ائمہ اربعہ میں کسی ایک کی تقلید کرنے اور عدم تقلید پر نکیر کرنے کی وجہ سے یہ اجماع منعقد ہوا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں بہت سے بڑے بڑے علماء نے عدم تقلید پر اپنی آراء کا اظہار کیا اور امت کے سامنے عدم تقلید کے مفاسد کو کھل کر بیان کیا۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

(۱) علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وعلى هذا ما ذكر بعض المتاخرين منع تقليد غير الاربعة لانضباط مذاهبهم وتقليد مسائلهم وتخصيص عمومها ولم يدر مثله فی غيرهم الآن لانقراض اتباعهم وهو صحيح۔

ترجمہ: اوراسی بنیاد پرائمہ اربعہ ہی کی تقلید متعین ہے نہ کہ دوسرے ائمہ کی، اس لیے کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب مکمل منضبط ہوگئے ہیں اوران مذاہب میں مسائل تحریر میں آچکے ہیں اور دوسرے ائمہ کے مذاہب میں یہ چیزنہیں ہے اوران کے متبعین بھی ختم ہوچکے ہیں اور تقلید کا ان یہ چار اماموں میں منحصر ہوجانا صحیح ہے۔(التحریر فی اصول الفقہ :552)

(۲)علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

وما خالف الائمة الاربعة فهومخالف لاجماع

یعنی ائمہ اربعہ کے خلاف فیصلہ اجماع کے خلاف فیصلہ ہے۔(الاشباہ:۱۳۱)

(۳)محدث ابن حجرمکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أما فی زماننا فقال أئمتنا لا يجوز تقليد غير الائمة الاربعة: الشافعی ومالك وابو حنيفة واحمد رضوان الله عليهم اجمعين

یعنی ہمارے زمانے میں مشائخ کا یہی قول ہے کہ ائمہ اربعہ یعنی امام شافعی، مالک، ابوحنیفۃ اوراحمد ہی کی تقلید جائز ہےاوران کے علاوہ کسی اورامام کی جائزنہیں (فتح المبین 166)

(۴)امام ابراہیم سرخسی مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وأما فی ما بعد ذلك فلا يجوز تقليد غير الائمة الاربعة

یعنی دورِاول کے بعدائمہ اربعہ کےسواکسی کی تقلید جائزنہیں۔(الفتوحات الوہبیہ:199)

(۵)مشہورمحدث ومفسرقاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فان اهل السنة والجماعة قد افترق بعد القرن الثلثة او الاربعة على اربعة المذاهب، ولم يبق

فی فروع المسائل سوی هذه المذهب الاربعة فقد انعقد الاجماع المرکب علی بطلان قول من یخالف کلهم۔

یعنی تیسری یا چوتھی صدی کے فروعی مسائل میں اہل سنت والجماعت کے مذاہب رہ گئے، کوئی پانچواں مذہب باقی نہیں رہا، پس گویا اس امر پر اجماع ہوگیا کہ جوقول ان چاروں کے خلاف ہے وہ باطل ہے (تفسیر مظہری:2/64)

(۶) شارح مسلم شریف علامہ نووی فرماتے ہیں:

اما الاجتہاد المطلق فقالوا اختتم بالائمة الاربعة------ الخ

یعنی اجتہاد مطلق کے متعلق علماء فرماتے ہیں کہ ائمہ اربعہ پر ختم ہوگیا حتی کہ ان تمام مقتدر محققین علماء نے ان چار اماموں میں سے ایک ہی امام کی تقلید کو امت پر واجب فرمایا ہے اور امام الحرمین نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔(نورالہدایہ:1/10)

(۷) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

استفتاء اور افتاء (فتویٰ پوچھنے اور فتویٰ دینے) کا دستور مسلمانوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی سے چلا آرہا ہے، اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کسی معین شخص سے ہمیشہ استفتاء کرے، یا کبھی ایک سے کرے اور کبھی دوسرے سے کرے، ایسی حالت میں کہ اس کے خیال میں وہی بات ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی ہے (یعنی یہ کہ اصل پیروی جناب پیغمبر خدا ﷺ کی ہے)۔اور اس میں کیا اشکال کی بات ہے، جب کہ ہم کسی بھی فقیہ پر اس طرح کا ایمان نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف علم فقہ کی وحی کی ہے، اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے، اور یہ کہ وہ معصوم ہے، ہم اگر ان فقہاء یا ان ائمہ مجتہدین میں سے کسی ایک کی اقتداء کرتے ہیں تو یہ سمجھ کر کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کا عالم ہے، اور اس کا قول یا تو کتاب وسنت کے کسی صریح کلام پر مبنی ہوگا یا ان دونوں میں سے مستنبط ہوگا، یا اس نے قیاس سے سمجھا ہوگا کہ فلاں صورت میں جو حکم شرعی ہے، وہ فلاں علت کے ساتھ معلق ہے، اور اس کا قلب اس پر مطمئن ہوگیا ہے اور

اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا تو گویا وہ یہ کہتا ہے کہ میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جہاں کہیں یہ علت پائی جائے وہاں حکم یہ ہوگا۔ اور یہ مسئلہ جس کو مجتہد نے قیاس کیا ہے وہ اسی عموم کے تحت میں آتا ہے تو درحقیقت اس سب کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف ہوئی، لیکن بہر حال اس کے طریق میں کچھ ظنی چیزیں ہیں، اور اگر ایسا نہ ہوتا (اور بات بالکل صراحۃً اور نصاً ثابت ہوتی) تو کوئی صاحب ایمان کبھی کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا، اب اگر ہم کو رسول معصوم کی جن کی اطاعت ہم پر اللہ نے فرض کی ہے، کوئی حدیث صحیح سند سے ایسی پہنچ جائے جو اس کے مذہب کے خلاف دلالت کرتی ہے اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں اور اس فقہ کے قیاس کی پیروی کریں جو ظنی ہے اور ایک اندازہ پر مبنی ہے تو ہم سے زیادہ ظالم کون ہوگا اور کل روز قیامت ہم خدا کو کیا جواب دیں گے۔ (حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول 125)

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

وهذه المذاهب الاربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الامة او من يعتد بها منها على جواز تقليدها الى يومنا هذا

یعنی یہ مذاہب اربعہ جو مدون و مرتب ہو گئے ہیں، پوری امت نے یا امت کے معتمد حضرات نے ان مذاہب اربعہ مشہورہ کی تقلید کے جواز پر اجماع کرلیا ہے۔ (اور یہ اجماع) آج تک باقی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ: 1/361)

محدث الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں:

"وبعد الما ?تين ظهر فيهم التمذهب للمجتهدين باعيانهم وقل من كان لايعتمد على مذهب مجتهد بعينه وكان هذا هو الواجب فى ذالك الزمان"۔ (انصاف:59)

ترجمہ: اور دوسری صدی کے بعد لوگوں میں متعین مجتہدین کا مذہب اختیار کرنا شروع ہوا اور ایسے لوگ بہت کم تھے جو متعین مجتہد کے مذہب پر اعتماد نہ کرتے ہوں اور اس زمانہ میں یہ واجب تھا۔

اور یہ تقلید شخصی بھی اب ائمہ اربعہ کی تقلید میں منحصر ہے، حضرت شاہ ولی اللہ نے ائمہ اربعہ کی اتباع

کوسوادِاعظم کی اتباع قرار دیا ہے:

"ولما اندرست المذاہب الحقة ۔۔۔۔۔الخ۔ (عقدالجید :38)

ترجمہ: جب صرف چار مذاہب کے علاوہ دوسرے تمام مذاہب مٹ گئے توان مذاہب اربعہ کی اتباع کرنا سوادِاعظم کی اتباع ہے اوران مذاہب سے نکل جانا سوادِاعظم سے نکل جانا ہے۔

حضرت شاہ صاحب ''عقدالمجید صفحہ 38'' پرفرماتے ہیں:

یادرکھو کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے اوران چاروں کو بالکل نظرانداز کردینے میں بڑامفسدہ ہے، اس کے کئی وجوہ واسباب ہیں، ایک یہ کہ امت کا اس پراتفاق رہاہے کہ شریعت کے معلوم کرنے کے بارے میں وہ سلف متقدمین پراعتماد کرے، تابعین نے اس بارے میں صحابہ پراعتماد کیا اورتبع تابعین نے تابعین پروعلی ہذاالقیاس ہردور کے علماء نے اپنے پیشرووں پراعتماد کیا، عقل سے بھی اس کا مستحسن ہونا ثابت ہوتاہے،

(۸)امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

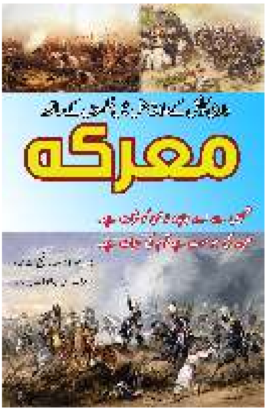
چونکہ بہت سے احکام ایسے ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے اس لئے لوگوں نے اس بارے میں ان لوگوں کی طرف رجوع کیا جوان کوان کی تعلیم دیں، اس لئے کہ وہ رسول کی تعلیم سے زیادہ واقف ہیں، اوراس کی منشاء ومراد سے زیادہ باخبر ہیں، پس ائمہ مسلمین کی جن کی مسلمانوں نے پیروی کی ہے حیثیت وہی ہے جووسائل اورراستوں کی، اوران رہنماوں کی ہے جولوگوں کورسول تک پہنچاتے ہیں اوراس کے کلام کی تبلیغ کرتے ہیں اوراپنے اپنے اجتہادواستطاعت کے مطابق آپ ﷺ کی مراد سمجھاتے ہیں۔(فتاویٰ شیخ الاسلام جلد2 صفحہ 201)

☆.....................☆.....................☆.....................☆

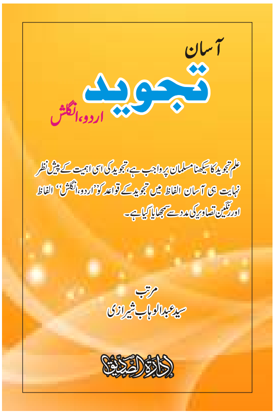
ماخذ

درس ترمذی	(مفتی تقی عثمانی مدظلہ)	مکتبہ دارالعلوم کراچی
الکلام المفید	(مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ)	مکتبہ صفدریہ گوجرانوالہ
محاضرات فقہ	(ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ)	الفیصل
تدوین فقہ اور چند فقہی مباحث	(مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ)	لکھنو
فقاہت ابوحنیفہ	مولانا خدابخش ربانی	طیب پبلیشر لاہور
فقہ ولی اللہی	مفتی محمد عبیداللہ الاسعدی	مجلس نشریات اسلام ناظم آباد کراچی
فن اصول فقہ کی تاریخ	ڈاکٹر فاروق حسن صاحب	دارالاشاعت
اجتہاد اور مذہب حنفی کی حقیقت	مفتی علی الرحمٰن فاروقی	ادارۃ العلم والارشاد کراچی
امام اعظم ابوحنیفہ بانی فقہ	ڈاکٹر محمد اشرف آصف	صراط مستقیم پبلشر لاہور
فقہ میں اجماع کا مقام	مفتی محمد رفیع عثمانی	ادارۃ المعارف کراچی
مباحث فقہیہ	قاضی مجاہدالاسلام قاسمی	فقہ اکیڈمی انڈیا
سیرت ائمہ اربعہ	قاضی اطہر مبارکپوری	ادارہ اسلامیات لاہور
تعارف فقہ	سید مشتاق علی شاہ	مکتبہ حنفیہ گوجرانوالہ
تدوین فقہ واصول فقہ	مولانا مناظر احسن گیلانی	الصدف پبلشرز کراچی
ویکیپیڈیا دائرۃ المعارف		
دائرۃ معارف العلوم		

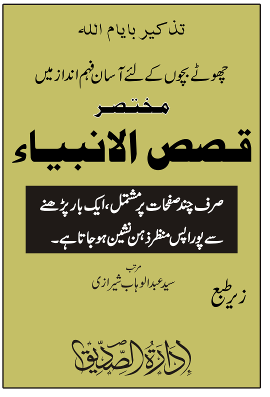

ان الدین عنداللہ الاسلام
تلخیص
عقائد اسلام
حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ
مرتب: سید عبدالوہاب شاہ
ادارۃ الصدیق


معرکہ

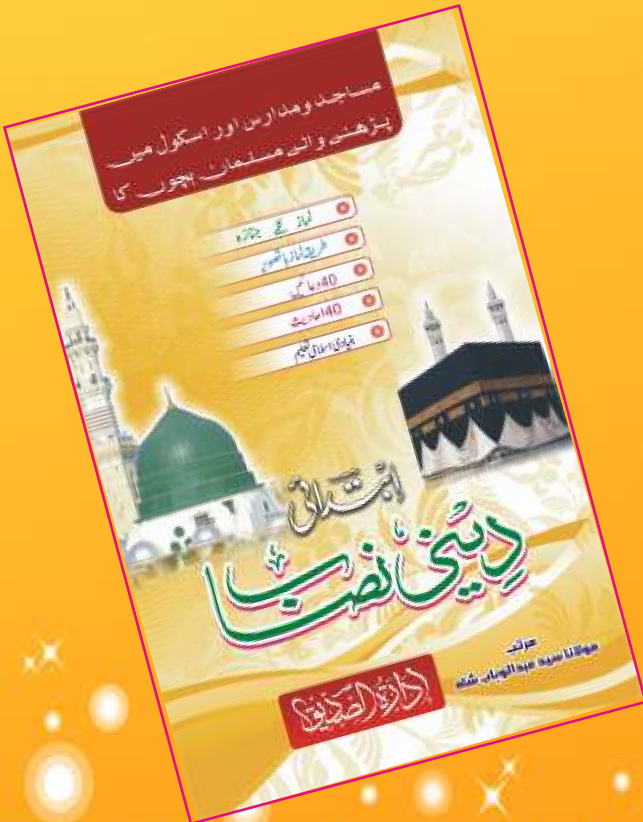

من قطع میراث وارثه قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة
جس نے کسی وارث کے حصہ میراث کو روکا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت سے اس کے حصے کو روک لیں گے
تقسیم میراث
کی اہمیت وفضیلت
تحریر
سید عبدالوہاب شاہ


آسان
تجوید
اردو، انگلش
علم تجوید کا سیکھنا مسلمان پر واجب ہے، تجوید کی اسی اہمیت کے پیش نظر نہایت ہی آسان الفاظ میں تجوید کے قواعد کو "اردو، انگلش" الفاظ اور رنگین تصاویر کی مدد سے سمجھایا گیا ہے۔
مرتب
سید عبدالوہاب شیرازی
ادارۃ الصدیق


فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ
polygamy
مردوں کے لئے ایک سے
زیادہ شادیاں
اور ان کے فوائد
مرتب
سید عبدالوہاب شیرازی
Multiple Wives
زیر طبع


تذکیر بایام اللہ
چھوٹے بچوں کے لئے آسان فہم انداز میں
مختصر
قصص الانبیاء
صرف چند صفحات پر مشتمل، ایک بار پڑھنے سے پورا پس منظر ذہن نشین ہو جاتا ہے۔
مرتب
سید عبدالوہاب شیرازی
زیر طبع
ادارۃ الصدیق


مسئلہ
عشر زمین کی پیداوار کی زکوۃ ہے، اگر زمین بارش کے پانی سے سیراب ہوتی ہے تو دسواں حصہ دینا واجب ہے، اور اگر زمین کو خود سیراب کیا جاتا ہے تو بیسواں حصہ دینا واجب ہے۔



ابتدائی
دینی نصاب